ادیب سہیل

بکھراؤ کا حرف آخر

زمانہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء (سقوط ڈھاکہ) تک

ادیب سہیل

نام کتاب — بکھراؤ کا حرف آخر

مصنف — ادیب سہیل

محرک اشاعت — پروفیسر خورشید بانو

ناشر — سید احمد امام

رابطہ : فون ۴۹۸۰۶۴۶

سرورق — حمید ساغر :۔ کمرہ نمبر ۶ چوہدری ولایت بلڈنگ
چوک وارث خاں ۔ مری روڈ ۔ راولپنڈی

اشاعتِ اول — ۱۹۹۶ء

اشاعت دوم — ۱۹۹۸ء

طابع — سعد پبلیکیشنز ناظم آباد ۔ کراچی

صفحات : 152، — قیمت : 100 روپے

زیر اہتمام

خانۂ اخبار

(صاف ستھرے اور معیاری ادب کی ترویج و اشاعت کا مرکز)

اے ۔ ۲۰۶ بلاک ۳ گلشن اقبال ۔ راشد منہاس روڈ کراچی

الف

خدائے لم یزل نے یہ وطن بخشا

ادا جتنا کرو شکرانہ تم اس مرحمت کے واسطے

کم ہے

تمہیں اس کو چلانا ہے

مساواتِ محمدؐ کے اصولوں پر

مساواتِ محمدؐ سارے عالم کے لیے مژدہ ہے جینے کا

یہ جھومر ہے زمانے کی جبیں پر خوبصورت اک قرینے کا

اسی جھومر سے پاکستان کا ماتھا سجانا ہے

چراغ اس اسوۂ احسن کا ہر دل میں جلانا ہے

ادیب سہیل

نام	ظہور الحق
پہلی ہجرت	۱۹۴۷ء
دوسری ہجرت	۱۹۷۴ء
مقام ملازمت	(ریلوے) دہلی ۔ کلکتہ ۔ سید پور ۔ ڈھاکہ اسلام آباد ۔ کراچی پاکستان فیچر سنڈیکٹ ۔ ڈھاکہ شریک مدیر روزنامہ پاسبان ۔ ڈھاکہ شریک مدیر ماہنامہ افکار کراچی
موجودہ ملازمت	مدیر ماہ نامہ ”قومی زبان“ کراچی انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی ڈی ۱۵۹ بلاک ۷ گلشن اقبال کراچی ۷۵۳۰۰
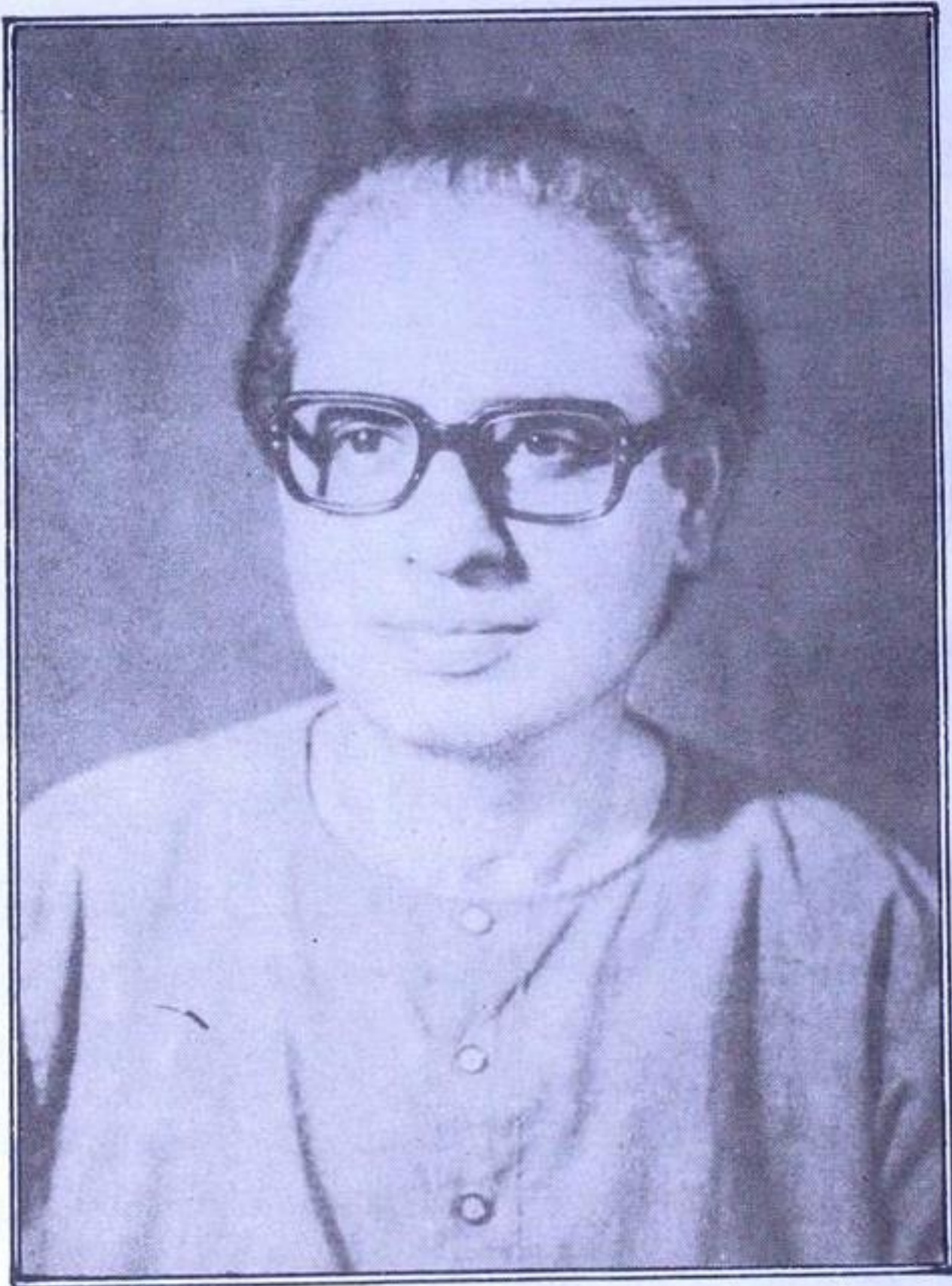
ادیب سہیل

بے تعارف ہی بھلے لگتے ہیں رہنے دو یونہی

ہم پتا بتلائیں کیا اپنا کوئی مسکن نہیں ہے

آئینہ سخن

اس کتاب میں میری وہ نظمیں اور غزلیں شامل ہیں جو سقوط مشرقی پاکستان سے پہلے اور بعد میں رونما ہونے والے واقعات و سانحات کا احاطہ کرتی ہیں۔ان میں کچھ کا بلکہ زیادہ تر کا انداز Objective خارجی ہے، جو اس وقت کے سانحات کے مطابق موزوں قالب تھا، البتہ چند اک ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جن کا مزاج Subjective داخلی ہے۔لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ دونوں طرح کی نظمیں دل زدگی کا نتیجہ ہیں اور احساسات کی سطح پر قلم بند ہوئی ہیں۔تاہم مشرقی پاکستان میں قیام کی پچیس سالہ تاریخ کی روداد مرتب کرنے کیلیئے دو ایک نظمیں مختلف نوعیت کی بھی شامل کر دی گئی ہیں جو پس منظر کے طور پر کام آسکتی ہیں ایسی ہی نظموں میں ایک "ویگن آباد" ہے جو قیام پاکستان کے فوراً بعد کے حالات کا منظر نامہ بن کر سامنے آتی ہے۔جس سے اس المناک صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے، جس میں تقسیم ہند کے وقت اپٹ کر کے مشرقی پاکستان آنے والے ملازمین، ان کے لواحقین اور ان کے دوسرے اقارب ایک طویل عرصہ تک گرفتار رہے۔لیکن اس کے باوجود ان مصائب کو اس امید پر سہار گئے کہ آج اگر یہ حال ہے تو آنے والا کل یقینی اس سے مختلف اور خوبصورت ہوگا۔لیکن یہ خواب پچیس برسوں تک شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا تاآنکہ سقوط کا نقارہ بج گیا۔

یہ نظمیں صرف اس لیے یکجا کر کے کتابی صورت میں چھاپ دی گئی ہیں کہ سقوط ڈھاکہ کا پس منظر اور پیش منظر قلم کاغذ کے ذریعے محفوظ ہو جائے تاکہ آنے والے زمانے میں کوئی شخص سقوط مشرقی پاکستان کی تاریخ پڑھنا چاہے تو اس کا ایک معتبر حوالہ "نغمہ اوّ کا حرف آخر" بھی بن سکے۔

مجھے وہ شام اب تک نہیں بھولی جب کتاب میں شامل میری طویل نظم "سمندر

اور قطرے " کی نیو پڑی اور دیکھتے دیکھتے اس پر ایک عمارت کھڑی ہو گئی ۔ ہوا یہ کہ میں اپنے ایک دیرینہ رفیق احمد سعدی کی کتابوں کی دکان پر سرِ شام بیٹھا ہوا تھا ۔ ایک ضعیفہ ہلتی ڈولتی دکان کے تھڑے پر آ کر بیٹھ گئیں ۔ نیم آستین کرتی کی جیب سے ایک پوٹلی نکالتے ہوئے بولیں " بابو سب لوگ او پاکستان جا رہے ہیں اتنے پیسے میں جانے کا کرایہ پورا ہو جائے گا ؟ پھر چند لمحے رک کر بولیں " کسی صورت وہاں پہنچ تو جائیں ۔ بلا سے وہاں درخت کے نیچے رہنا پڑے ہر وقت سر پر تلوار تو نہ لٹکتی ہو گی ۔ سکون سے جئیں گے ۔ " ضعیفہ کے منہ سے یہ جملے سن کر معاً میں ۱۹۴۷ء میں چلا گیا ۔ جب قیام پاکستان کا اعلان ہوا اور لوگوں کا کارواں مغربی و مشرقی پاکستان ہجرت کر جانے کی سوچنے لگا تھا ۔ اس وقت اکثر گھروں میں یہ صورت حال دیکھنے میں آتی تھی مرد کہتے تھے کہ ہجرت کرنے سے پہلے ذرا سوچ سمجھ لیا جائے ، لیکن ان کی عورتیں کہتی تھیں ، تمہیں اپنی پڑی ہے ۔ بچوں کے مستقبل کی سوچو ، ان کی جان پر بنی ہے اور تمہیں سمجھ بوجھ کے قدم بڑھانے کی فکر پڑی ہے ۔ بلا سے وہاں آسمان کے نیچے رہیں گے ۔ سر پر تلوار تو نہ لٹکتی ہو گی ۔ سکون سے تو رہیں گے ۔ "

ضعیفہ کی یہ باتیں سن کر میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا ، پچیس سال بعد پھر وہی سوال ، وہی سکون کی تلاش ، میں بے قرار ہو گیا ۔ میرے ذہن میں ایک نظم کا خاکہ مرتب ہونے لگا ۔ میں نے احمد سعدی سے گھر جانے کی اجازت چاہی اور سعدی نے پوچھا کیوں کیا بات ہے ؟ اچانک اتنی جلدی کیا پڑ گئی ۔ میں یہ کہتے ہوئے کہ کل اس کا جواب دوں گا ۔ گھر آیا اور قلم کاغذ لیکر بیٹھ گیا ۔ اور ضعیفہ کے ان ہی مکالموں سے " سمندر اور قطرے " کا آغاز کیا اور ان ہی پر اختتام بھی ! مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مصرعے پر مصرعے لکھتا چلا جاتا تھا ، یہ سلسلہ بہت دیر تک قائم رہا ، اگلے دن جو اس تعمیر میں کسر باقی رہ گئی تھی وہ بھی پوری ہو گئی ۔

اس کتاب میں بعض نظمیں ایسی بھی ہیں کہ پل کی پل میں سجی سجائی کاغذ پر موجود ہو گئیں ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ذہن میں کہیں سجی بنی بیٹھی تھیں اور بدا کر ذوق جلوہ نمائی میں اپنے حجلہ سے نکل آئی ہیں ۔

سب باتوں سے قطع نظر جو بات اس وقت میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ ان نظموں غزلوں کو کتابی صورت میں آپ تک پہنچانے کا مشکل کام میرے برادر عزیز احمد امام نے انجام دیا ہے۔ یہ بات کسی تکلف میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ واقعتاً اس میں سرتاسر انہی کی مساعی جمیلہ کو دخل ہے، ورنہ میرا حال یہ ہے کہ لکھنا آتا ہے اس لیے لکھے جا رہا ہوں، لکھے ہوئے کو سمیٹنا اور سمیٹ کر یکجا کرنا آج تک نہیں آیا (مجھے اپنے ان احباب پر رشک آتا ہے جو اپنے سلسلے کی ایک سطر بھی احتیاط سے سنبھال رکھتے ہیں) لہذا اس کتاب کے منظر عام پر آنے میں تمام ستائش کے وہی مستحق ہیں۔ ان کے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے میں ان کی بیگم پروفیسر خورشید بانو شانہ بہ شانہ رہیں جو بہر حال رفاقت کے ناتے ان کی ذمے داری بنتی تھی۔

یہاں مجھے اپنے پنڈی کے رفیق حمید ساغر کا شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے بڑے "پیار" سے سرورق بنایا ہے۔

میں آخر میں، اس قدر کہنے پر اکتفا کروں گا کہ سپردم بہ تو مایہ خویش را" اس کے بعد اس کی قدر و قیمت متعین کرنا آپ کا کام ہے۔ یہ کوئی اتنا بڑا کارنامہ بھی نہیں جس کے لئے لام قاف کا لہجہ اختیار کرتا۔ یہ کتاب ۱۹۷۱ء کے اس عظیم المیہ کی محض جھلکیاں پیش کرتی ہے۔ ع

گر قبول افتد زہے عز و شرف

ادیب سہیل

حرف آخر

میں نے ادیب سہیل کو پاکستان فیچر سنڈیکیٹ ڈھاکا کے توسط سے شائع ہونے والے فیچرز سے جانا اور پہچانا جو وقتاً فوقتاً اردو کے اخبارات میں چھپتے رہتے تھے۔ یہ ایک نہایت عمدہ علمی اور معلوماتی سلسلہ تھا پھر ان کی علمی، ادبی و صحافتی کارگزاریوں کو ڈھاکا کے واحد روزنامہ "پاسباں" کے توسط سے دیکھنے کو ملا۔ جو ان کے زمانہ ادارت میں صوری و معنوی دونوں اعتبار سے پاکستان کے کسی بڑے اخبار سے مقابلہ کرتا تھا

۱۹۷۴ - ۷۵ میں ان سے شرف ملاقات حاصل ہوا۔ پھر تواتر کے ساتھ ان کی نظمیں اور دیگر تخلیقات پڑھنے کو ملتی رہیں۔

ادیب سہیل کا اگرچہ ایک ترقی پسندانہ نظریہ ہے، لیکن انھوں نے اپنی تخلیقی سرگرمیوں میں نظریہ کو کبھی ہارج و دخیل نہیں ہونے دیا۔ بلکہ یہ زندگی کے مسائل کو سمجھنے سمجھانے میں مددگار ثابت ہوا۔

ادیب سہیل کی شاعری جدید دور کی شاعری ہے، جس میں بے معنی اور بے محل غنایت اور نغمگی نہیں ہے۔ انھوں نے موسیقیت کو صرف اپنایا ہی نہیں بلکہ ٹی۔ ایس ایلیٹ کے الفاظ میں اپنے ذہن کو دنیائے علم اور موسیقی کے ذخیرے سے پر کیا۔ پھر اسے پلاٹینیم کے طور پر استعمال کیا جو اپنی ہیئت کبھی نہیں بدلے لیکن دوسروں کو تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ادیب سہیل نے اپنی شاعری میں آسان اشارے کنائے یا استعارات استعمال نہیں کیے۔ اس میں حسن اور obscurity انگریزی کے عظیم شعراء رابرٹ براؤننگ اور Gerard Manley Hopkins یا خود ٹی۔ ایس ایلیٹ جیسی پیدا کی۔

بیسویں صدی ذہین لوگوں کی صدی مانی جاتی ہے۔ یہ دور سیدھی سادی، بیانیہ کانوں کو بھلی لگنے والی شاعری کا نہ تھا اور نہ ہے۔ صنعتی دور کے ترقی یافتہ لوگوں کے ذہنوں کو چونکا دینے والی کیفیت کی شاعری درکار ہے۔ تاکہ لوگ پڑھ کر سوچنے پر مجبور

ہو جائیں کہ شاعر نے لکھا کیا ہے؟ یہی سوچ پھر شاعر کو دریافت کرنے کے عمل پر اکساتی ہے۔ ادیب اپنے دور کے تقاضے سے بہ خوبی واقف ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں غیر معروف استعارات کا جس خوبصورتی سے استعمال کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ وہ اپنے شعری مجموعہ "بکھراؤ کا حرف آخر" میں ہومر کی ILIAD کے انداز میں بین کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایلیڈ میں صدیوں پہلے Troy کی تباہی۔ بادشاہ PRIAM کے بیٹوں اور بیٹی کلائی ٹیم نسٹرا (CLYTEMNESTRA) کی تباہی ملک کی تباہی، اخلاقیات کی تباہی اور انسانیت کی تباہی کا نقشہ اسی طرح کھینچا گیا ہے۔ (ایلیڈ کا مصنف ہومر ہر چند کہ یونانی نسل کا تھا) ILIAD کو پڑھ کر انسان ایسی ہی المناکی کی مختلف صورتوں اور کیفیات سے گزرتا ہے، جس کا المناک نظارا ادیب سہیل نے "بکھراؤ کا حرف آخر" کی نظموں مثلاً طوفان نوح، سانتا بار، قاتل گرم رقص، میں کیا کہوں گا؟، خاک سے کٹا ہوا شخص اور طویل نظم "سمندر اور قطرے" میں پیش کیا ہے۔ اس تقابلی مطالعہ سے یہ بات پایہ تصدیق کو پہنچتی ہے کہ تاریخ اپنے کو دہراتی رہتی ہے کبھی TRAGEDY کی صورت میں اور کبھی COMEDY کی صورت میں۔

سیاست دانوں کی عاقبت نااندیشی، ذات کوشی و ذات فروشی نے ہر دور میں انسان کو انسان سے لڑایا انسانی خود غرضی ایسی ہی سفاکیوں اور ہولناکیوں کو جنم دیتی ہے۔ "بکھراؤ کا حرف آخر" جس ILIAD کو جنم دیتا ہے۔ وہ نصف صدی کا قصہ ہے یعنی تقسیم کے بعد کا۔

شاعر کی کیفیت پیغمرانہ ہوتی ہے، اس کا پیغام ہر ایک کے لیے ہے اور ہر ایک کا دکھ سکھ اس کا اپنا ہوتا ہے۔ ملک ذات اور قوم کی قید و بند سے وہ آزاد ہوتا ہے۔ سسکتی ہوئی دکھی انسانیت کا کرب وہ محسوس کرتا ہے خواہ دشمن ہی کیوں نہ ہو۔

خورشید بانو
پروفیسر شعبہ انگریزی
گورنمنٹ لیاقت کالج کراچی

بات سے بات ....

ہمارے اسکول میں سالانہ طرحی مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ ایک سال اسکول کے ہیڈ ماسٹر جناب پرویز شاہدی کے بے حد اصرار پر حضرت جگر مراد آبادی، اسکول کے طرحی مشاعرے میں کمسن طلبہ شاعروں کی دلجوئی کے لیے کلکتہ تشریف لائے۔ مشاعرہ ہوا، طالب علم شعرا کا کلام سنا گیا۔ پہلے میری باری آئی، میں نے پہلے ہزل اور بعدازاں غزل سنائی۔ جگر صاحب نے میرے اس شعر پر مجھے محبت سے گلے لگا لیا۔

اگر حور و جنت کی خواہش ہے زاہد
تو تیری عبادت ، عبادت نہیں ہے

مگر میری شعر گوئی کی اطلاع پر میرے بزرگوں نے حوصلہ افزائی کی بجائے ایسی غیر شاعرانہ پذیرائی کی کہ اللہ کی پناہ ....! کل کا تائب، آج بھی اس صنف لطیف سے تائب ہے۔

اس وقت میری آنکھوں میں چمک اور لب پر مسکراہٹ اس لیے ہے کہ شاعر نہ ہوتے ہوئے بھی ایک شعری مجموعے کی ترتیب کے طفیل میرے دیرینہ شعری ذوق کی تسکین کا سامان فراہم ہوا ہے۔ اور میرے دل کے گوشہ میں شعر گوئی کی دبی ہوئی خواہش کی اس بہانے تکمیل ہو رہی ہے۔ گویا اس شعری مجموعہ میں شامل کلام میرے دل کا ترجمان ہے۔ آپ اسے اس دور پر آشوب کی تاریخ بھی کہہ سکتے ہیں جسے عرف عام میں سقوط ڈھاکہ کہا گیا ہے، یہ کلام الفاظ کے روپ میں ان چھوٹے چھوٹے کرب ناک واقعات کے دریچے وا کرتا ہے جو اس دور میں مرحوم مشرقی پاکستان میں رونما ہوئے۔

میرا اور ادیب سہیل کا بہت قریبی رشتہ ہے۔ وہ ادب کی دنیا تخلیق کرتے ہیں، میں اس دنیا کا ناظر ہوں۔ مجھے شعری ذوق ورثہ میں نہیں ملا لیکن وارثان شعر و سخن جیسا انس رکھتا ہوں۔ میں ان سے اور ان کی شاعری سے حد درجہ محبت کرتا ہوں۔ اسی لیے یہ چند حروف تحریر کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

ادیب سہیل کی بنیادی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے انسان ہیں۔ اور جس میں یہ دونوں خصوصیات یکجا ہوجائیں وہ دو آتشہ یا قند مکرر کا لطف فراہم کرتا ہے۔

ادیب سہیل تقریباً نصف صدی سے شعر کہہ رہے ہیں۔ اس تمام عرصے میں انھوں نے انسانی رشتوں اور تعلقات کی پاسداری کی ہے۔ روش روش اس پر کاربند رہے ہیں، بدترین صورت حال میں بھی جب آدمی ٹوٹنے اور بکھرنے لگتا ہے، انھوں نے اس انسانی رشتہ کو استوار اور نفرت کی جگہ محبت کو سربلند رکھا ہے۔ انقطاع یگانگت کے دور میں بھی انشراح انسانیت کے قائل رہے ہیں۔

ادیب سہیل کی شخصیت کی کئی جہات ہیں، وہ وضع دار انسان ہیں، اچھے شاعر اور ذمہ دار محقق و ناقد اور موسیقی کے حرف و صوت شناس ہیں۔ لیکن وہ ایسے ادیب نہیں جو اپنی تخلیقات کے پرزے پرزے جوڑ کر رکھتا ہے اور پھر ان کو یکجا منظر عام پر لانے کے جتن میں سو کوئیں جھانکتا ہے۔ یہ کام ان کی اجازت کے بغیر انجام دینے کا میں نے ذمہ لیا ہے۔ اس پر مہمیز کا کام میری شریک حیات پروفیسر خورشید بانو کے اس مضمون نے کیا جو انھوں نے بہ طور قدردانی ادیب سہیل کی طویل نظم "سمندر اور قطرے" سے متاثر ہوکر انگریزی میں تحریر کیا ہے۔

ناانصافی ہوگی اگر اس موقع پر میں بڑے بیٹے یاور امام، اپنی کمسن بیٹی اسکول کی طالبہ عروج امام اور کمسن بیٹے خاور امام کا ذکر نہ کروں، جنھوں نے اس کتاب کی اشاعت میں اپنی والدہ اور مجھ سے کم دلچسپی نہیں لی۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ان بچوں نے ہمیں اس کام میں ہمہ دم مستعد رکھا تو غلط نہ ہوگا۔

آخر میں جناب محمد غیاث الدین صاحب کا بھی شکر گزار ہوں کہ انھوں نے بڑی جانفشانی لگن اور سلیقے سے مجموعے کی کمپوزنگ کی۔

احمد امام

بار دگر

ادیب سہیل کے مجموعہ کلام " بکھراؤ کا حرف آخر " کی اشاعت ہمارا ایک دیرینہ خواب تھا جو بالآخر گزشتہ سال شرمندۂ تعبیر ہوا۔

" بکھراؤ کا حرف آخر " ۱۹۷۱ء میں رونما ہونے والے المیہ مشرقی پاکستان کا ایک زندہ حوالہ ہے۔ اس میں شامل نظمیں اور غزلیں دل زدگی کے قلم سے رقم ہوئی ہیں۔ ہر نظم " از دل خیزد بر دل ریزد " کی کیفیات سے مملو ہے۔ اور اپنا ایک فوری ردعمل بھی رکھتی ہے۔ اس ردعمل کے تحت پروفیسر خورشید بانو نے کتاب میں شامل طویل نظم " سمندر اور قطرے " میں ہومر کی عظیم نظم ILIAD کا وتیرہ و پیرایہ دیکھا اور اپنے تعارفی کلمات میں اس کا برملا اظہار کر دیا۔ ان کے ذہن میں " آفتاب اور ذرے کے اس تقابل کا روزن شاید اس لیے کھلا کہ موصوفہ کی عمر عزیز کا معتد بہ حصہ انگریزی پڑھنے اور پڑھانے میں صرف ہوا بلکہ ہورہا ہے۔ وہ انگریزی ادب پر ایک خاص نظر رکھتی ہیں۔ پروفیسر خورشید بانو کو یہ خیال بھی ہوا کہ سقوط مشرقی پاکستان کے المیے کے پس منظر اور اور پیش منظر پر ادیب سہیل کی نظم " سمندر اور قطرے " ایک اور ILIAD کو جنم دیتی ہے۔

بعدازاں پروفیسر خورشید بانو کا یہی خیال اس شعری مجموعہ کی اشاعت کا محرک بنا۔ اور جب یہ مجموعہ شائع ہو کر منظرعام پر آیا تو ادبی حلقوں میں توقع سے بڑھ کر اس کی پذیرائی ہوئی۔

ہم ارباب شعر و ادب اور اندرون و بیرون ملک کے اردو اور انگریزی اخبارات و رسائل کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں جنھوں نے اپنے موقر آرا، تبصروں اور تحسینی کلمات سے ہماری اس سعی کو اعتبار بخشا اور حوصلہ افزائی کی۔ اس حوصلہ افزائی کا ہی یہ ثمرہ ہے جو " خانہ اخیار "، " بکھراؤ کا حروف آخر " کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کے قابل ہو سکا۔

احمد امام

نظم نما

غزل نما

نظمیں

بکھراؤ کا حرف آخر

مرے گھر کے دیوار و در
اور احاطے کی مٹی میں پاؤں جمائے
اناناس کے پودے، کیلے کے پیڑ اور گلابوں کے چہرے
۔۔۔عجب مضطرب ہیں
کئی دن سے رخسار پر کربِ وحشت سجائے یہی پوچھتے ہیں
کہاں جا رہے ہو۔۔۔۔۔؟
کئی دن سے میں خوں شدہ ہوں
جواب اس "کہاں" کا میں کیا دوں
کہ بے نطق سا ہو رہا ہوں
مرے دل میں جو کرب ہے اس کا پرتو
اناناس کے پودوں، کیلے کے پھولوں، گلابوں کے چہروں پہ بھی
۔۔۔۔دیکھتا ہوں
مرے گھر کا برسوں کا سمٹاؤ بکھرا ہوا ہے
ہر اک چیز کے جیسے پر لگ گئے ہیں۔۔
کسی کا تقاضا ہے میں اونے پونے ہر اک چیز بیچوں
میں کہتا ہوں جو شئے سہولت سے بک جائے بیچو

جو رہ جائے چھوڑ دو
کہ اس گھر میں جو میرے بعد آئے گا
----وہ بھی تو صاحبِ آل ہو گا
کسی نے جو پوچھا جریدوں کا کیا ہو؟
تو میں نے کہا ان کو رہنے دو یونہی
لہو ان میں میرا ورق در ورق ہے
انھیں بیچنا اپنا خوں بیچنا ہے
میں یہ چاہتا ہوں
انھیں کوئی لے جائے اتنا ہی کہہ کر
مری طرح ان سے محبت کرے گا۔
کئی دن سے میں گھر کے باہر ہی رہتا ہوں
بکھراؤ کی تاب مجھ میں نہیں ہے
کبھی جو کسی کام سے گھر کے اندر گیا ہوں
تو دہلیز پاؤں میں میرے لپٹ سی گئی ہے
مرے گھر کی پروردہ بلّی
کچھ ایسے اچک کر مری گود میں آ رہی ہے
کہ جیسے ہو عرصے سے قربت کی پیاسی
مرے کوچ کی شام سر پر کھڑی ہے
وہ مٹی جہاں آگہی میری بالغ ہوئی تھی
----جدا ہو رہی ہے

مرے ذہن و جاں میں عجب زلزلہ ہے
مرا ذائقہ تلخ سا ہو گیا ہے
پڑوسی کبھی جو مرے گھر پر قبضے کی سازش کا تھا اک محرّک
وہ اب میرے بکھراؤ کے حرفِ آخر پہ رونے لگا ہے
میں گھر سے نکل کر سفر کے لئے ٹرانزٹ کیمپ کی سمت جانے لگا ہوں
تو بِلّی مرے ساتھ ہی چل پڑی ہے
عجب والہانہ، ترانہ[1] نے اس کو معاً گود میں لے لیا ہے
میں ہل سا گیا
عارفہ[2] رُندھ گئی ہے

(۱) بیٹی - (۲) بیوی

قاتل گرم رقص

آخر شب
تیز تر تھی تال
قاتل گرم رقص

اور دامان ہوا
بوئے خوں میں تر بہ تر
شاخ کی مانند کٹ کر گر رہے تھے جسم و سر
چند خون آشام سائے اس کو چوٹی سے پکڑ کر کھینچتے تھے
اک طرف

دست بستہ جاں بخشی کے لئے
وہ فرشتوں کا دیے جاتی تھی اپنے واسطہ
اور فرشتے پاؤں میں لپٹے تھے گھنگرو کی طرح
پل کے پل میں اک شکستہ ساز کی اُبھری صدا
چاند پر خوں ہو گیا
دف کا سینہ چاک تھا
بے صدا گھنگرو تھے خاک اور خون میں ---
بکھرے ہوئے

میں کیا کہوں گا؟

وہ جب بھی مجھ کو ادب کی محفل میں مل گئی ہے
بڑی محبت سے گھر پہ آنے کی دی ہے دعوت
سقوطِ ڈھاکہ کا سانحہ جو گزر گیا اس پہ غمزدہ ہے
وہ چاہتی ہے مری زبانی سقوطِ ڈھاکہ کے قبل اور بعد کے
سبھی خوں فشاں حقائق کو دیکھ ڈالے
اور ان پہ اک یادگار ناول کا ڈول ڈالے
کبھی جو خود میں نے چاہا اس دیدہ سانحے پر قلم اٹھانا
تو وہ شنیدہ لگا ہے مجھ کو
وہ سانحہ اس قدر بڑا ہے بیان کی دسترس سے باہر ہے
صرف احساس کے احاطے میں آسکے گا
میں اس کی بابت کسی سے کچھ ذکر کرنا چاہوں
تو خواب لگتا ہے
کر بھی دوں تو
گماں گذرتا ہے خود ہی اپنے کہے ہوئے پر مبالغے کا
میں اس کے اصرار پر اگر اس کے گھر بھی جاؤں
تو کیا کہوں گا ـ ـ !

امید و بیم کے درمیان

نئے سفر کے تصوّر سے پُر ہر ایک دماغ
ہر ایک شخص نظر آرہا ہے پا بہ رکاب
ہے خلط ملط تاثر ہر ایک چہرے پر
کبھی ہے کرب کی صورت
کبھی نشاط کا رنگ
کبھی امید کی شمعیں سی جگمگاتی ہوئی
کبھی پر افشاں ہیں خدشات و بیم کے سائے۔
وہ اضطراب و کشاکش کہ بے کلام و نام
ہے بے یقینی کے عالم میں حال و مستقبل
جو بات لمحہ اوّل میں ہے خوشی کی اساس
وہی ہے لمحہ دیگر میں وجہہ رنج و ہراس
کسی سے کوئی بھی ملتا ہے تو بہ ایں احوال
سوال کرتا ہوا
اور جواب کا طالب
جواب دے بھی تو کیا؟
جواب دے بھی تو کون؟
ہر ایک ذہن میں چلتی ہے گرم و زرد ہوا
ہر ایک دل پہ ہے چھایا ہوا سا گرد و غبار
جواب خود ہوا اس راہ میں سوال نما!

رائیگاں

دوست بھی کہتے ہیں شرحِ غم کروں
میری بھی خواہش ہے غم کو جاودانی روپ دوں
میں نے لفظوں کے کئی پیکر تراشے بھی۔ مگر
سب مرے معیارِ احساسات سے کمتر ہوئے
ذہن کے سب کونے کھدرے ڈھونڈ مارے
لفظ موزوں کے لیئے
ضائع گئیں یہ کوششیں
اب میں اس عالم کو اپنے کیا کہوں؟
جب خامئ پیکر تراشی بھی نہیں
اس سفر میں خامۂ پرخوں بھی ہے میرا شریک۔۔
در حقیقت اتنا قدآور ہے غم
اور اتنے پُر وسعت ہیں احساساتِ غم
اس کے سائے میں اگائے جو بھی پودے لفظ کے
پنپے نہیں
حرف جو رکھے برابر اس کے
بونے ہو گئے!

رشتہ

بڑا کروفر تھا
بڑی دھوم سے اس کا رشتہ ہوا تھا
ابد تک پھلے پھولے رہنے کی کتنی دعائیں ملیں۔ اور
ہر اک دانگ
اس حسن سادہ کی شہرت ہوئی تھی
یہ شہرت
یہ صورت
یہ محبوبیت اس کے شایان بھی تھی
طبعیت پہ اس خوبصورت کے مٹی کا، دریا کا،
موسم کا گہرا اثر تھا۔
ابھی ایک پر شور طوفان ہے تو ابھی صاف مطلع
رفیق سفر اس طبعیت کے رس کو سمجھنے سے قاصر
رفیق سفر کا رقیب ان ہی کمزوریوں کی وجہ سے
سفر کے ازل سے سدا
بعد اگانے کے درپے
رفیق سفر کی ادا ناشناسی

رقیب سفر کی ازل کی رقابت کا نکلا نتیجہ
کہ برسوں کی ہم رنگی
کچے دھاگے سے ٹوٹی
ابد تک پھلے پھولے رہنے کی ساری دعاؤں کے باوصف
ابد کی جدائی مقدر ہوئی ہے۔

خالی ہاتھ سوالی چہرے

ہم بھی ہیں اس شہر کے باشی
جس نے ہزاروں ہاتھوں میں کشکول دیا ہے
کل تک تھا یہ اپنا عالم
راہ میں وا ہاتھوں میں جب تک
اک اک "چھنی[1]" رکھ نہیں دیتے
دل کو چین نہیں آتا تھا
گھر والی بھی اک دو خالی پیٹ میں دانے پہنچا کر ہی
خود کھانے میں سکھ پاتی تھی۔
آج یہ منزل آپہنچی ہے
کل سے زیادہ خالی ہاتھ ------- سوالی چہرے
دل میں درد جگاتے ہیں۔
درد کے مارے جیب میں جاتا ہاتھ مگر رک جاتا ہے
گھر والی کو پکی ہوئی ہانڈی پہ کبھی تو جبر سا کرنا پڑتا ہے
کبھی تو ڈھکن چھوتے ہی کچھ ایسی وہ ڈر جاتی ہے
جیسے ہانڈی میں کالے اندھے مستقبل کی
ناگن چھپ کر بیٹھی ہو۔

---

[1] ایک سوراخ والا پیسہ

ہم جہاں ہیں وہاں سے ہم کو بھی

راستے بند رابطہ مسدود
اہم اخبار آج بے خبری
ذہن خاموش کان بجتے ہیں
پتّا کھڑکے تو دل دھڑکتا ہے

گاہے مچھر کی بھنبھناہٹ پر
ہے گماں ہم کو شور قاتل کا
گاہے اپنی کسی صدا پر ہم
چونک جاتے ہیں، کانپ جاتے ہیں

خندۂ گل ہوا ہے بارِ نظر
بولنا در کنار -- رکھلنے پر
نونہالوں کے جی الجھتا ہے
نغمگی ضرب ہے سماعت پر
ریڈیو ہے غلاف کے اندر

چند ہفتوں سے ایسا عالم ہے
جس کی تشریح سے قلم قاصر
جیسے لٹکے ہوئے ہیں سولی پر
ہم نہ مرتے ہیں اور نہ جیتے ہیں

سفر کا دائرہ

سفر مرا جیسے دائرے کے عمل میں بیتا
چلا جہاں سے، وہیں پہ بے رخت سا کھڑا ہوں
میں دو جگوں سے وطن کو کاندھے پہ اپنے رکھ کر گزر رہا ہوں
جہاں اسے رکھ دیا اٹھا کر
اسی کو رہتل اسی کو مٹی، اسی کو اپنا وطن بنایا
نئے وطن میں رفیق و ہم رخت بھی میسّر ہیں
ان کی شاداب بزم بھی ہے
اور اس کی مٹی میں اپنے خوں کو شریک کرنے کا عزم بھی ہے
مگر جو اک فرق اک زمیں کے مزاج سے دوسری کا ہوتا ہے
اس کو محسوس کر رہا ہوں!

مریم

خندقوں کو کر گئی خالی ہزیمت خوردہ فوج
خندقوں کے پاس ۔ دور
خوں میں غلطاں
اک غریب شہر کی صورت پرخچہ سے پڑے ہیں لشکری
حکم کے بندہ
محلّاتی سیاست کے شکار
خندقوں میں
زندہ ۔۔۔۔۔ مردہ
زخم خوردہ
برہنہ تن عورتیں
ہم جنھیں مریم کہیں
تاجِ سرِ ناخم کہیں
حرّیت کے ساز کا سرگم کہیں

ماں کا پیار

جنم بھومی پہ جاں چھڑکنے کو
جس نے طاعون کی مثال دیا
وہ قبیلے کا فلسفہ ہے ۔۔اسے
خانہ بردوشیوں نے جنم دیا
تجربے سے یہ انکشاف ہوا
جس کے سینے میں ماں کا پیار نہیں
وہ کسی ماں کا پیار کیا سمجھے
جس کی اپنی زمیں نہیں ہوتی
اس کا چرخ بریں نہیں ہوتا!

کالی ہوا

یوں چلی کالی ہوا
پھول سی اُجلی خوشی کا آشیاں
ہوگیا یکسر دھواں
دو جگوں کی قُربتیں
فاختائیں جل بُجھیں کچھ ---کچھ فضا میں
پھڑ پھڑا کر رہ گئیں
ان کے انڈے اور بچے
سرسراتے ناگ کے رحم و کرم پر رہ گئے
میں پرندہ بھی نہیں جو اُڑ چلوں آکاش میں
محفوظ رہنے کے لیے
میرا مسکن ہے زمیں
میرا رستہ لہر، خوشبو، روشنی
اور آس پاس
سرسراتے پھر رہے ہیں ناگ

اور کالی ہوا

میرے رستے میں یہ کیا موڑ آگیا؟
رخت میں میرے ہے سائے کا ہراس
مجھ سے میرا چھن گیا ہے اعتبار
میرا دشمن بن گیا ہے میرا نام
خود مری پہچان قاتل ہو گئی۔!

دعا۔ اور لوہا

"عجب تماشہ ۔!
ادھر مسلسل ہلاکتوں کی اڑان جاری
ادھر نہ کوئی مزاحمت ہے، نہ اسلحہ ہے۔
نہ سازو ساماں
جو بڑھ کے فوراً ہلاکتوں کے طیور کو زیر دام لائے
جو ان پہ شہباز بن کے جھپٹے
جو ان کے ہیکل سے پر کتر دے
"جناب اتنا نہ خوف کھائیں
یقین رکھیں
یہ طائر مرگ یونہی آئیں گے اور جائیں گے
دندنائیں گے، سر پہ منڈلائیں گے ۔ مگر
ان سے اپنا کوئی زیاں نہ ہوگا
یہ شہر حضرت کی برکتوں کے حصار میں ہے
فضا میں ان کی دعا کی چادر تنی ہوئی ہے....."
مکالمے خیر کے یہیں تک پہونچ سکے تھے
کہ طائر مرگ رعد کی طرح گڑگڑایا

مکالمے میں شریک سب لوگ
مختلف خندقوں میں دبکے
سروں پہ تھا حشر محو پرواز
اجل کے طائر طواف خوں ریز کر رہے تھے
گرج کے غوطے لگا رہے تھے
زمیں کا سینہ دہل رہا تھا
گھروں کے شیشے چیخ رہے تھے
صدائے محشر تھمی تو کہرام مرگ جاگا
ہوائی اڈہ کے پاس کے ریلوے کوارٹر ہدف بنے تھے
مکیں کچھ ان کوارٹروں کے تھے خاک اور خون میں نہائے
جو خندقوں میں چھپے تھے وہ خندقوں ہی میں دفن ہو گئے تھے
ردائے برکت لہو لہو تھی
حصار فیضان گر پڑا تھا
میں سوچتا تھا۔۔۔۔
میں سوچتا تھا کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے
دعا سے پہلے، دعا کے ہم راہ صد ہا ٹن اڑتے پھرتے لوہے کروں فراہم!

تم دھرتی ہو

(بیگم صوفیہ کمال کے نام)

تم ناری ہو
تم دھرتی ہو
تم دھرتی کے اجلے بھوش کی اپچھک ہو
تم دھرتی پر اتیاچار، برودھی ہو
اتیاچار پہ دکھ پرکاش بھی کرتی ہو
تم ناری کی نرجاتن پر نینن نیر بہاتی ہو
سمے پڑے پر رکھک بن کر پربت سے ٹکراتی ہو
جوالا مکھی بن جاتی ہو۔
اتیا چار، برودھی پردرشن پہ تمھارے
مجھ کو اپنے انتردشا سے گوربھ ہے
میں ناری سمّانت ہوں، میں دھرتی کا بھگتی ہوں

لیکن اس پل میرا ہردے اندر سے پھٹ جاتا ہے
جب سمان کا واتاورن دو دھاروں میں بٹ جاتا ہے
گائیں جب کالے ناگوں کو اپنا دودھ پلاتی ہیں
جب بھاشا، جاتی کی بھگتی ہین ہوائیں چلتی ہیں
لاٹ سا یہ آدرش تمھارا تنکے سا بہہ جاتا ہے

روشنی

صدا سرِ شام ریڈیو سے اُبھر رہی ہے
"غنیم پرواز کا ہے خطرہ
تمام درز و شگاف خانہ کو پاٹ ڈالیں
گھروں میں اس طرح روشنی کو اسیر کر دیں
کہ اس کی ہلکی جھلک بھی باہر قدم نہ رکھے
کہ یہ جھلک دعوت قیامت سے کم نہیں ہے"

کچھ ایسے لمحوں نے روپ دھارا
عجیب تبدیلیوں کی مظہر ہے رات، مفہوم حسن بدلا
سکون ظلمت میں مل رہا ہے
اندھیرا راحت فزا ہوا ہے
خفیف سی روشنی بھی دل پر گراں ہوئی ہے
نظر پہ جگنو کا رقص بھی بار ہو چلا ہے
یہ چاندنی کل تھی جو کسی خوب رو کا پرتو
یہ آج دہشت کا پیش خیمہ ہے۔ اک نشاں ہے

رقیب پر جیسے مہرباں ہے
سدا کا محبوب چاند لگتا ہے دستِ جلاد کا ہمیں اک برہنہ خنجر

ہمیں تو ان تیرہ تار لمحوں نے اب کے وہ روشنی عطا کی
کہ گھر کی شمعیں بجھا کے بھی مطمئن ہیں۔ نازاں ہیں۔ سرخرو ہیں۔

(یہ نظم ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے موقع پر لکھی گئی تھی)

نان ہی ماہ فلسفہ ہے

نئے سفر سے عقیدتوں کا یہ دو جگوں میں صلہ ملا ہے
نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن کا سلسلہ ہے
نئے مسافر گھروں سے اپنے نکل نکل کر
گھروں کے سائے میں خیمہ زن ہیں
پناہ گہ میں پڑے ہوئے ہیں
جو خشک روٹی کا ایک ٹکڑا کسی دریچے سے آگرے تو
ہجوم بچوں کا پل پڑے گا
جو ایک مٹھّی اناج کا آسرا کسی در سے مل گیا تو
بہت سی مائیں سحر سے تا شام آسرے میں کھڑی رہیں گی
یہ آپ محتاج آپ حاجت روا ہیں
غم خوار ان کا کوئی نہ رہ گیا ہے
جو ناخدا ہے سو اپنی موجوں میں کھو گیا ہے
جو اک خدا ہے سو وہ بھی خاموش ہو گیا ہے
عقیدتوں کے سفر کا یہ ماحصل بھی کیا ہے؟
جہاں سے جیسے چلے تھے اس سے خراب و خستہ وہیں پہ اب بھی کھڑے ہوئے ہیں

نئے سفر نے شعور بخشا
وطن سے بڑھ کر کوئی بھی ارض جہاں نہیں ہے
نئے سفر کے مہیب لمحوں نے یہ سمجھایا
کہ نان ہی اصل زندگی ہے
کہ نان ہی ماہ فلسفہ ہے
کہ نان ہی حرف اوّلیں ہے

مثلث

اک عقیدت مجھ کو لے آئی
چلے آئے یہاں
یہ عقیدت آنکھ والی تھی کہ نابینا
ابھی اس بحث کا موقع نہیں
انقلاب آیا تو میرا آشیاں
میں - اور مرے اہل و عیال
ایسے بکھرے ہیں کہ ہیں اک دوسرے سے بے خبر
کون جانے کچھ خبر آئے بھی ان کی یا ابد کا کرب بے خبری ملے
کیا کروں میں اس کا لکھ کر مرثیہ -
غم مجھے اس کا نہیں میں کیا تھا اور کیا ہو گیا
جانتا ہوں انقلاب
کوئی بھی چپکے کبھی آیا نہیں
یہ کسی خلوت کی دوشیزہ نہیں
جو حنا بستہ قدم سے آئے حجلے کی طرف
یہ ہے ڈمرو کی دھمک
بھیروں کا ناچ
یہ لہو کی نذر اور جاں کی سبیل

حلقۂ زنجیر
سنگینوں کا خونی دائرہ

میرا غم ہے حلقۂ زنجیر۔ خونی دائرے سے مختلف
میرا غم یہ ہے کہ ہوں میں اک مثلث کا اسیر
یہ اسیری ہے مری تاریخ کا اک کرب آگیں حادثہ

حادثہ یہ!

ہر ضلع میرا ہے۔ پر میرا نہیں!

سرنڈر

بے یقینی کا ہے سیل بے پناہ
پائے رفتن بھی سوال اور جائے ماندن بھی سوال
اُجلے پرچم کے تلے سارے ہی سر خیل عساکر
جارہے ہیں دشمنوں کے سامنے ہتھیار رکھنے کے لئے
سر پہ منڈلاتا ہے ہر دم غیر طیاروں کا غول
اور ہم بے آسرا
دیکھتے جاتے ہیں ان کو
کچھ بھی کر سکتے نہیں
بے بسی کا کرب اپنی حد کو ہے پہنچا ہوا
ہر کوئی ہے گھر میں اپنے بے سکوں
ہر کسی کو غیر کے گھر میں ہے یک گونہ قرار
وقتِ ناہنجار نے چھینی ہے ہر دل کی بہار
بھوتنوں نے ہنستے بستے شہر میں جیسے دیے ہوں پنجے گاڑ
اُگ رہا ہے ہر طرف انجانی دہشت کا پہاڑ !!

خاک سے کٹا ہوا شخص

خاک سے جو بھی کٹ جاتا ہے
اس کو اپنی خاک کی خوشبو چین ہنیں لینے دیتی ہے
ساری عمر اس خاکستر میں چنگاری جلتی رہتی ہے
جب سے ہوش نے آنکھیں کھولیں
رختِ سفر کندھے پہ دھرا ہے
پیروں سے رفتار بندھی ہے
دم رکھنے کو چھاؤں میسر آئی بھی تو
بڑھ کے خزاں کی دھوپ نے اس کو چاٹ لیا ہے
چلتے چلتے اب ہم جس بھی موڑ پہ آکر ٹھہر گئے ہیں
پانی میٹھے
سوہنی دھرتی
پیار بہت ہے
لیکن مجھ کو رختِ سفر کندھے سے نیچے رکھتے ہوئے اب ڈر لگتا ہے!

۔۔۔کالا سمندر

بھوک اور دریوزگی
ایک دو دن کا اگر ہو مسئلہ تو سہہ بھی لے
پیڑ کے پتے ہی کھا کر رہ بھی لے
بھوک اور دریوزگی ہو جائے گر نا مختتم اک سلسلہ
تو آدمی پھر کیا کرے
جب سبھی سامان خانہ بک چکا
کچھ نہ باقی رہ گیا بکنے کو خود ہی بک گئی
اس میں حیرت کی بھلا کیا بات ہے
آج یہ صورت ہے اس کی کل ہمارے سات ہے
شہر ناپرساں میں سب ہیں ایک کشتی پر سوار
حال فاقے کا ہے اک کالا سمندر
ہر طرف پھیلا ہوا ہے منتقم لہروں کا جال
ڈھونڈنے جائیں کہاں ایسے میں خوش آئند مستقبل کو ہم
جب یہ عالم ہو تو جو بھی ہو سو کم
ایسے میں کیوں حرف گیری کیجئے
کیوں نہ ہمدردی کو دعوت دیجئے!

شہرِ ناپُرساں

یہ پریشان حال لوگ
انتہائے پُرامیدی میں سفر کے
باقی ماندہ سب اثاثے بیچ کر
شہر ناپرساں میں ہیں طوفان زدہ ۔ اشجار کی صورت کھڑے
ہر کسی کو ہے یہاں اذنِ سفر کا انتظار ۔!
سامنے منزل ہے
اور اذن سفر
ہر کس و ناکس کا حصہ ہے مگر
ہر کس و ناکس کے حصے میں نہیں ۔

مرگ خوں

ہم کو ہم سے کر گئی تقسیم اک کج مج لکیر
خون میں داخل ہوا ہے فاصلہ
ایک بے معنی حقیقت ہے خیال خویش فکر اقربا
ماند پڑتی جا رہی ہے ہر تعلق کی دمک
مضطرب دل ہے کہاں کھوئی قرابت کی للک
سرد مہری سے لہو سرشار ہے
روح میں ابھری ہے کس کس روپ میں کج مج لکیر
ہم پہ کس کس طور اثر انداز ہے دوری کا سم
کس طرح بکھرے ہیں ہم
کتنا رسمی ہو گیا احساس غم
جس کی شفقت کا لہو تعمیر میں میرے رہا سرگرم کار
مرگ پر اس کی مرے سینے میں کوئی کرب کا ہلچل نہیں
دشتِ احساسات میں حد نظر تک ابر کا پارہ نہیں
ایک بھی نوک پلک پر اشک کا تارا نہیں
جیسے اس خالق سے میرا خون کا رشتہ نہیں!

میرا شہر

مرے شہر کو دوستو کیا ہوا ہے؟
نہ چہرے کو لمسِ صبا ہے میسّر
نہ شاخوں پر اس کی کہیں فاختہ ہے
ہر اک لمحہ خدشات کے کالے بادل سروں پر تنے ہیں
ہر اک دل میں دہشت کا دشنہ گڑا ہے
جو اک پل ہے آزاد تو دوسرے پل
سلاخوں کے پیچھے مقید پڑا ہے
رہائی اسیری کے مابین کا فرق بھی کالعدم ہو چکا ہے
یہ ہے مرگ انبوہ میں غم کا عالم
کہ کہسار بھی سر پہ خاشاک سا ہے
جو گھر بار رکھتے تھے گھر سے نکل کر
بھلا کر سبھی حال و ماضی کے سپنے
کھُلے آسماں اور درختوں کے نیچے بسیرا کیے ہیں
درختوں کے پتوں ہی پہ جی رہے ہیں

دکانوں کے مالک
دکانوں کی خاکستروں پر کھڑے ہیں
جلے ادھ جلے سب اثاثے پڑے ہیں
سر صبح ہر کارخانے کی سیٹی بھی بجتی ہے
مزدور بھی کام پر جارہے ہیں
مگر ان کی محنت کئی ماہ سے بے صلہ ہے
خبر گشت ہے چاکری مشتبہ ہے
عجب سلسلہ ہے
چڑھاوے کے زیور

جہیزوں کا ساماں
بدن کے لباس اور بچھانے کے بستر
پلنگ میز، آئینہ، کرسی، پنگورے
گھڑی، ریڈیو، وینٹی بیگ، شالیں
کتابیں، قلم، آبرو، ماستا، دودھ دانی، کھلونے
غرض اونے پونے زمانے کے ماروں کی ہر چیز بازار میں بک رہی ہے

پریشاں ہے ہر شخص جینے کے ہاتھوں
یہ جینا بھی اک مسئلہ بن گیا ہے
مقامی، کئی دوست صورت
عجب اجنبی سے ہوئے ہیں

کئی جانے پہچانے چہرے
جو شئے چاہتے ہیں گھروں سے اٹھا کر لیے جا رہے ہیں
کہ رسم و رہِ آشنائی یہی ہے

شب و روز ہر رہ گذر میں
ہر اک عمر کے سیکڑوں ہاتھ پھیلے ہوئے ہیں
بجھے طفل، مایوس باپ اور خزاں بخت مائیں
سوالی بنے ہیں
جسے ناز تھا اپنے نقدِ ہنر پر
ہنر کا وہ راجا بھکاری ہوا ہے
یہ شہرِ ہنر ور کہ شہرِ گدا ہے
مرے شہر کو دوستو کیا ہوا ہے؟

یہ گداپیشہ نہیں

یہ جو تپتی دھوپ میں
پگھلی ہوئی شہراہ پر
کاسہ بَرداری کے فن سے نابلد
ہاتھ پھیلائے ہوئے بر قعے قطار اندر قطار
ہیں سحر تا شام آوارہ خرام
یہ گداپیشہ نہیں
ایسے دن کے خواب بھی دیکھے نہیں
خستہ حالی کا وہ عالم ہے کوئی رہ گیر اگر
بھول سے بھی ہاتھ دے دیتا ہے اپنی جیب میں
اس کو لے لیتے ہیں حلقے میں
معاً پروانہ وار
ان کی مجبوری کو ہم کیا نام دیں؟
اس کی عکاسی کی خاطر اپنے پاس

لفظ کے پیراہن موزوں نہیں
ان کے اس حال زبوں کا کس کو ہم الزام دیں

ان کو -- جن کی مملکت پچیس برسوں تک رہی نوزائیدہ
ان کو -- جو باعتبار ذہن خود بھی دو جگوں تک رہ گئے نوزائیدہ
یا پھر ان کو -- جن کے باعث ملک یہ دولخت ہو کر رہ گیا

پھنگیوں کے مسافر

ہے مہر بر لب سا ایک ہیجان چار جانب
اور نرخ کا بدنما پرندہ زمیں سے ناگاہ سوئے افلاک پر فشاں ہے
نگاہ لوگوں کی اس کی جانب مراجعت کو لگی ہوئی ہے
مراجعت کی عبث توقع سے فائدہ کیا؟
مرے لیئے یہ عجب نہیں ہے
کہ کیوں گیارہ رُپے کے کپڑے کو اسی نوے رپوں میں لینے کا جبر سہہ کر بھی
لوگ کہتے ہیں پھر بھی ارزاں ہی مل گیا ہے
مرے لیئے یہ عجب نہیں ہے
کہ کیوں وہ غلّہ جو اپنے موسم میں بیس روپوں میں ایک من دستیاب ہوتا تھا
تین سو کی حدوں سے آگے نکل گیا ہے
مرے لیئے یہ عجب نہیں ہے
کہ کس طرح اک اکیلی ساری پہ باری باری سے چار جسموں کی ستر پوشی کا
بار ہے
پھر بھی ڈھو رہی ہے۔
مجھے نہ اس بات پر ہے حیرت

کہ کیوں ہر اک شے کو روگ عنقا کا لگ گیا ہے
نہ یہ کہ کیوں پیرہن کو زندہ کفن کو مردہ ترس رہا ہے
میں جانتا ہوں
زمیں کے جس پیڑ کے پرندے ہیں
جس طرح یہ اُبھر کے آئے ہیں
غیر بولی پہ پچھتائے ہیں
اس میں ان کو اسی طرح سے اڑان بھرنا تھی
بھر گئے ہیں۔

کبھی یہ ہوتا ہے وسوسہ سا
وہ لوگ جو بات بات پر تھے عقاب دشمن
جنھیں کبوتر کا رقص گھر میں عزیز لگتا تھا
خود بھی ہمراہ ناچتے تھے
وہ لوگ جو تیتو میر کی روایات کے امیں تھے
جو روزِ اول سے سامراجی مخالفت کے رہے ہراول
اناج کے ساتھ اپنی مٹی سے جو اگاتے تھے انقلاب
اور انقلابی !
جو درس دیتے تھے چپے چپے میں عالمی بھائی چارگی کا
وہ بیشتر سرمہ در گلو ہیں
نگاہ میں ان کی ہے خشونت

اوران کی انسان دوستی کا حسین معیار
انقلابی روایتوں کا بلند مینار
جیسے پستہ قدوں کے حلقے میں گم ہوا ہے
نہیں نہیں یہ حقائق کل نہیں یہ جزوی حقیقتیں ہیں۔
کثیر ایسے ہیں اس نیستاں میں
اب بھی اجلے ہیں
جن کی آواز کے اجالے میں تیرگی کے سیہ پروں کو اماں نہیں ہے۔
وہ صاف لفظوں میں کہہ رہے ہیں
کہ نرخ کا بدنما پرندہ
جو سوئے افلاک پرفشاں ہے
زمین پہ اس کو اتارنے سے بھی پہلے پہلے
تم اس کے سارے حواریوں کو زمیں پہ لاؤ
جو بانس پر چڑھ گئے ہیں خود بھی
چمٹ کے بیٹھے ہیں پھنگیوں سے

جو مجھ سے پوچھو تو میں کہوں گا
کہ بانس اور بانسری کے سب مستعار کھیلوں کو ختم کردو
کہ پھنگیوں کے مسافروں پر کمند بھی کارگر نہیں ہے

خیال کی رو

سوچتا ہوں کرب کی پھننگی پہ میں بیٹھا ہوا
پیڑ کو کس کی نگاہیں کھا گئیں
شور، نغمے، چہچہے، سب کیا ہوئے؟
بند کیوں ہے غول اندر غول طائر کا ورود؟
جس کو دیکھو دم بخود سا
اور پر تولے ہوئے

وحشتوں کے درمیاں
ایک خواہش سب میں قدرِ مشترک
ہاتھ اگر پرواز اک آجائے تو
مڑ کے پھر ہرگز نہ دیکھیں وہ نشیمن کی طرف
ایک کے بعد ایک کے اڑنے کا ہے تانتا بندھا
سب اثاثہ بیچ کر اُڑنے کے جو قابل ہوئے ہیں وہ بھی خوش
ان کو اڑتے دیکھ کر ہیں وہ بھی خوش
جو فلاکت کے سبب پرواز کے قابل نہیں
دونوں کا شاید کہ ہے اک مدعا

ایک رہوارِ ہوا کے ہیں سوار
پیڑ کا سینہ ہے شق پرواز پر
دمبدم ہوتے ہوئے خالی نشیمن کے لیئے ہے خوں شدہ
یہ بھی بجا
پیڑ کا لیکن ہوائے ظلم پر کچھ بس نہیں
یہ بھی درست
دل مرا نیرنگیِ احساس کی آماجگاہ
چند جو پرواز کے لائق ہوئے ان کی خوشی
سیکڑوں لوگوں کا غم
برگِ موسم ریز کی صورت جو سرگرداں ہوئے
بے زری پائے سفر کی جن کے اک زنجیر ہے
ان ہزاروں کا خیال
بے پروبالی کے زخموں سے ہیں جو اس درجہ چور
ان کو گر موقع بھی اڑنے کا فراہم ہو تو اڑ سکنا محال!
میرا غم ان سب کا غم ہوتے ہوئے بھی ہے مگر کچھ مختلف

میرا غم!
اپنے گھر میں غیر کی صورت قیام
دوست کی آنکھوں میں رنگِ دشمنی

میرا غم!

وہ معاصر اہلِ خامہ
وہ بلند آدرش، احباب و ندیم
میرے رشحاتِ قلم کے واسطے رہتے تھے جن کے ماہنامے فرش راہ
وہ عزیزانِ عزیز
غائبانہ جن سے میری خوب ہوتی تھی نباہ
کس مپرسی کی سیہ ناکی میں جن کے چند حرف
بن کے آسکتے تھے اک دل خوش کرن
جن کے نامے وقت کی اس سنگلاخی میں مہک سکتے تھے پھولوں کی طرح
جن کے احساسات کی خوشبو سے آسکتی تھی مجھ میں تازگی
ہیں کہاں ؟ وہ کیا ہوئے ؟
بٹ گئے
پتھر ہوئے یا خود کشیدہ مصلحت کے دائرے میں کھو گئے
سوچتا ہوں کرب کی پھنگی پہ میں بیٹھا ہوا!!
اک پرندہ چہچہایا ہے قریب آکر تسلی کے لئے
اک کبوتر آن کر بیٹھا ہے پر لی شاخ پر

شانتا ہار

پچیس دن تک
یہاں تھی کرب و بلا کی صورت
یزیدیوں کا محاصرہ تھا
حسینیوں پر طرح طرح کے ستم رواں تھے
نہ ان کو تھی روشنی میسر نہ آب و دانہ
ہر ایک شے کا مقاطعہ تھا
ہر اک طرف سے مقاطعہ تھا
اور حکم جلاد عمل میں آتا تھا جستہ جستہ!
یہاں سے جلاد جا چکا ہے
یہ شہر ہے کچھ عجیب خاموشیوں کا مسکن
نہ کوئی آواز ہے
نہ چہرہ
نہ مسکراہٹ
نہ کوو برزن میں دھوم بچوں کی
اور نہ غوغا نہ چہچہا ہے
نہ انجمن ہے نہ شاعران کرام جو انجمن کی جاں تھے

بیاضیں آتش بجاں ہیں
اشعار بھینٹ مقتل کی چڑھ گئے ہیں

نہ درس گاہیں وجود میں ہیں
نہ طالبِ علم ہی سلامت
نہ زندہ ان کے اساتذہ ہیں
لڑھکتی پھرتی ہے گیند رستے میں
کھیلنے والے اس کے ناپید ہو چکے ہیں

لہو لہو ہے تمام منظر
تمام گھر بے مثال بربادیوں کے مظہر
کچھ ایسے گھر ہیں جو اپنے خوں میں سنے ہوئے ہیں
کچھ ایسے گھر ہیں جو اپنے ہی بے کفن مکینوں کے مقبرے ہیں
کچھ ایسے گھر ہیں کہ جن کے طاقوں میں
سر بریدہ نفوس گلدان کی طرح سے سجے ہوئے ہیں
کچھ ایسے گھر ہیں
جو بے مکیں ہیں
مگر یہ آثار کہہ رہے ہیں کہ دستِ قاتل سے یہ بھی شاید نہ بچ سکے ہوں

جو آرہے ہیں نظر سرِ شہر
وہ مری طرح تازہ وارد ہیں

سب کو اپنے عزیز از جاں کی جستجو ہے

اُمید موہوم سب کا سرمایہ

(چھپ چھپا کر مبادا کنبے کا کوئی بھی فرد بچ رہا ہو)

سبھی کے چہرے عجب سی وحشت کا آئینہ ہیں

کہ شرح مشکل

جو اس کی کوشش کرو تو الفاظ تنگ داماں

ہے قابل رحم وہ ضعیفہ

جو اپنے کنبے کے لعل و گوہر کو ایک اک کر کے کھو چکی ہے

ہر اک سے جو پوچھتی ہے

"لوگوں کو کیا ہوا ہے

گھروں سے اپنے نکل نکل کر

جہاں ہتاں سو رہے ہیں بے سدھ

جگاؤ تو جاگتے نہیں ہیں --"

سماں ہے عبرت کا وہ عفیفہ

جو ڈوب کر تال میں کنارے لگی ہوئی ہے

بجائے دیوار جس کے نازک بدن میں پرچم گڑا ہوا ہے

سماں ہے عبرت کا وہ شگوفہ

جو بطنِ مادر میں قتل ہو کر بھی

ایسے ظاہر ہوا

کہ بے ستر ماں کا محرم بنا ہوا ہے

حسین افضال

کسی سے لاشوں کے شہر میں یہ پتا لگائے

کہ اس کی بیوی

اور اس کے بچے

کہاں ہیں

آیا وہ بچ رہے ہیں

کہ دست قاتل کی بھینٹ وہ سب بھی چڑھ چکے ہیں

وہ اپنی وحشت میں ایک اک گھر کو دیکھتا ہے

جہاں کہیں بھی دکھائی دیتا ہے اس کو لاشوں کا ڈھیر

اس کو الٹ پلٹ کر

وہ اپنے پیارے شناسا چہرے کو کھوجتا ہے

شناسا چہرے کی جستجو میں

وہ ایک مسجد سے متصل تال کے کنارے ٹھٹھک گیا ہے

جو ایک مقتل سا لگ رہا ہے

قریب کے کھیت میں کھڑی ہے گدھوں کی ٹولی

نظر یکایک اک ایسے لاشے پہ جم گئی ہے

کہ جس کے بازو میں ننھا لاشہ بھنچا ہوا ہے

مگر یہ لاشے :

یہ ماں اور اس کے ہنال تازہ
کچھ اس طرح مسخ ہو چکے ہیں
شناخت مشکل!
شناخت کا صرف اک وسیلہ ہے
اس کا بیسر
بدن کی سوجن سے ناک میں گھُتھ گیا ہے بے حد
وہ کہہ رہا ہے
تلاش میں جس کی تم پریشاں ہو، میں وہی کم نصیب تو ہوں
مجھے اٹھا لو
مجھے اٹھا کر
تم اپنے بازو میں بھر لو
اپنے گلے لگا لو
گلے لگا لو.... گلے لگا لو!
سلیم داخل ہوا ہے اک ٹوٹے، پھوٹے، گھر میں
یہیں وہ پیدا ہوا تھا
انیس سال پہلے
سلیم کی ماں بھی ساتھ آئی ہیں
ایک موہوم اُمید لے کر
مبادا شوہر کی شاعری کی بیاض مل جائے
جس کے اک اِک ورق کو اس نے لہو سے اپنے سجا دیا تھا

ڈھنڈار گھر کہہ رہا ہے ان سے
اب آئے ہو جب ہوا ہے قصہ تمام سارا
مگر یہ اچھا ہوا کہ تم سب یہاں سے پہلے ہی جا چکے تھے
سلیم بکھری ہوئی
جلی ادھ جلی کتابوں کے ڈھیر میں ڈھونڈتا تھا
والد کی شاعری کی بیاض -- لیکن
جہاں ہتاں اڑ رہے تھے اوراق ان کتابوں کے
جن کے شاعر نے اپنی جاں تج کے سارے گھر کو بچا لیا تھا
سلیم کی ماں کی خشک آنکھوں میں اس کا دل رو رہا تھا خاموش
یہاں جو آئے تھے سب ہی اپنے عزیز اقارب کو ڈھونڈتے تھے
پہاڑ سے غم نے سب کو پتھر سا کر دیا تھا
سبھی کی آنکھوں میں مرگِ انبوہ کا اثر تھا
اور اشک آنکھوں سے بھاپ بن کر ہوا ہوئے تھے

سلیم خوش ہے کہ باپ کی شاعری کے بکھرے ہوئے بہت سے ورق ملے ہیں
ورق ورق کو سلیم کی ماں نے اپنی جاں سے لگا لیا ہے
"امید موہوم" پر بہار آ گئی ہے اس پل

سہیل اک دوست کا ہے لڑکا
اسے بھی لاشوں کے شہر میں اپنے باپ ماں کی تلاش لے آئی ہے
مگر ہے یہ حال اس کا

نہ بولتا ہے نہ ڈولتا ہے
نہ اشک آنکھوں سے رولتا ہے
تلاش میں اک عزیز کے آگیا ہوں میں بھی قریب اس کے
تو دیکھ کر مجھ کو جیسے آتش فشاں کی صورت وہ پھٹ پڑا ہے
کہاں گئیں آپ کی وہ انسانیت کی باتیں
کہاں گئے
وہ کہ جن کو آدرش جاں سے پیارا تھا
اس کو سب کچھ ہی جانتے تھے
غلط تھا
سب جھوٹ تھا
خدارا اب اور آدرش والی باتیں نہ کیجیئے گا
دگرنہ کوئی بھی مجھ سے بڑھ کر بُرا نہ ہوگا

طرح طرح سے وہ مجھ پہ قہیم برس رہا ہے
میں اس کی خفگی سے خوش ہوں
اس طور غم کے طوفان منجمد کو بہاؤ کا راستہ ملا ہے
میں اس کی خفگی سے مطمئن ہوں
کہ اس کی ہستی شکستگی کے بھنور سے ثابت نکل چکی ہے
کئی دنوں پر سہیل سے سامنا ہوا ہے
تو کہہ رہا ہے!
مجھے خدارا معاف کر دیں
میں اپنی آشفتگی میں کیا کچھ نہ کہہ گیا تھا

میں اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر یہ کہہ رہا ہوں
مجھے پتا ہے کہ اپنے کنبے میں تم ہی شاید بچے ہو تنہا
تمہارا غم میرے غم کے آگے پہاڑ سا ہے
تمہارا غم میرے غم سے بے شک عظیم تر ہے
کہ تم نے اس کوہ غم کو برداشت کر لیا ہے
عظیم وہ ہیں
گنوا کے پیاروں کو
اپنے ہوش و حواس قائم رکھے ہوئے ہیں
عظیم تم ہو!

حرّیت کے نشہ میں سرشار بس!

حرّیت کے نشہ میں سرشار بس،
ہے کھڑی اسٹینڈ پر
اور ہر کھڑکی کے پاس
کتنے خالی ہاتھ ہیں پھیلے ہوئے
جو مسافر چھت پہ تھے بیٹھے اچھالیں چھنیاں[1]
چھَنیوں کی تال پر
بے بسوں، سرگرداں چہروں، برقع پوشوں کا ہجوم
بے تال رقصاں ہوگیا
مچھلیوں کی طرح بحرِ خاک پر تیرا کیا
پل کے پل میں رقص کا تھا یہ عروج
خود کہاں --- برقع کہاں
بچہ کہاں -
رقص کے ہمراہ ابھرے فاتحانہ قہقہے
قہقہوں کے درمیاں اک تبصرہ
چند "چھَنیوں" میں یہ منظر ایسا کچھ مہنگا نہیں !

۱- چھیسہ

غم تمہارا بھی بڑا ہے

غم تمہارا بھی بڑا ہے
غم ہمارا بھی بڑا
دردمندی کا تقاضا ہے یہی
اپنا غم محسوس جب کرنے چلو تو غم ہمارا بھی رہے پیش نظر
غم تمہارا یہ کہ تم حق کے لیے
جب بڑھے آگے تو سنگینوں کی زد میں آگئے
پر تمھیں اس کا سرور اس کا صلہ
ملک کی صورت میں حاصل ہوگیا
غم ہمارا یہ کہ ہم تو بار بار
بے دیار و بے صلہ مارے گئے
ہم میں تم میں فرق بس اتنا ہے جو دنیا تمہارے حق میں
بحر بے کنار
وہ ہمارے واسطے گویا حصار اندر حصار
دیکھنا چاہو اگر تم غم ہمارا تو یہ پس منظر رہے پیش نظر
غم تمہارا بھی بڑا ہے !
غم ہمارا بھی بڑا !!

طوفان نوح

۱۲/ نومبر ۱۹۷۰ء

ہنستے بستے گھر، چمکتے جال
مانجھی کا غرور
پکی فصلیں، جگمگاتی بالیاں، کھیت اور کھمار (۱)
دہقان کا پیار
سن رسیدہ بیبیاں
پیڑ کے شانے پہ پھیلائے ہوئے پٹ سن کے تار
دلہنیں اور کنواریاں
بید کی شاخوں کی لچکیلی بہار
کھیت کی مینڈوں پہ میدانوں میں،، برگد کے تلے
ننھے اور نوخیز راکھالوں کے کرتب، کھیل، خوشیاں
اور دھمار
ساحلوں کی بستیاں
ماں کی صورت

رات کے بستر پہ آنکھوں میں لیے سارے مناظر سو گئیں
کہ صبح دم
جب یہ جاگیں گے تو ان کے ہاتھ میں
یہ تھما دینگی معاً سورج کی گیند
کچھ کے شانوں پر سجا دینگی یہ کرنوں کی ردا
اور دیں گی کچھ کو نذرانہ گلِ خورشید کا
صبح آئی تو نگاہوں سے تھیں اوجھل بستیاں
ساحلوں سے بستیوں تک سر کشیدہ تھی فقط دیوارِ آب
ہر طرف تھی بازگشتِ صورِ اسرافیل لہرائی ہوئی
زندگی جس سے عبارت تھی وہی آب و ہوا
ناگنوں کی طرح بل کھائی ہوئی
سامعہ سے صرف ٹکراتا تھا کالی روپ شب کا قہقہہ
گیند تھی لڑھکی ہوئی
چاہ سے اس کو اٹھا کر کھیلنے والے نہ تھے
تھی ردا پھیلی ہوئی
اس کو شانے پر سجانے کے لیئے سجے نہ تھے
پیڑ بھی پانی کے قدموں کے تلے روندے گئے
دیکھتے جو شوق سے منظر گلِ خورشید کا
ساحلوں کی ہنستی گاتی بستیاں عشتار کی مانند روتی ہی رہیں
روند کر ان کو روانہ ہو گیا کسلاِ آب

آددو نیبو وشارو کا عتاب

برلبِ رودِ فرات

شہر شوری پک کی طرح

ساحلِ بنگال میں

دیوتا کوئی نہ آیا اتتباہ زورِ طوفاں کے لیئے

اپنے منئوں کے لیئے

دھار کر مچھلی کا روپ

کوئی وشنو بھی نہ آیا لے کے یہ چیتاونی :

"اپنے گھر کو توڑ کر

سارے اثاثے چھوڑ کر

اپنی ہستی کے بچانے کے لیئے کشتی بنا

ساتھ ہر اک بیج لے، ذی روح جوڑے کو بٹھا........"

بچ گیئے طوفاں سے جو چند اک نفوس

اپنے حلیے میں وہ اپنے جدِ امجد آدم و حوا سے کچھ بھی

کم نہ تھے

جیسے وہ اس دور کے آدم نہ تھے

کچھ کے رخساروں کی دولت تھیں عجب سی وحشتیں

کچھ کی آنکھوں کا مقدر تھیں خلا کی گردشیں

کچھ تھے پانی میں کھڑے

کچھ تھے پتوں ہی کو اپنے جسم کا محرم کیے

اور کچھ کا بے لباسی ہی لباس
سب کے چہرے پر یہ لکھا تھا خدا یا کیا ہوا!!
سب کے چہرے تھے عجب حیرانیوں کے آئینے
ہر کوئی تھا اپنا غم بھولا ہوا
حلقہ ہائے آب میں بے آب مر جاتا ہوا
بعد از طوفان سارے دیس کے
دیوتاؤں میں ہے واویلا مچا
مسئلے کی پھننگیوں سے ان کی ہمدردی بجا
مسئلے کی جڑ تلک پہنچے اگر ان کی نظر-----!
سوچتا ہوں قبل طوفاں کے زمانوں میں انھیں
کون سے آدد کی دہشت نے کیا گردوں نشیں
شہر واویلا میں جو اس جوش سے آئے نہیں
اور اپنے دیس باشی دیوتا تو بعد از طوفان بھی
جگمگاتے ہیں سرِ بالائے بام
کچھ کو جنبش بھی ہوئی ہے تو برائے نام ہی
میں تو دیوتا بھی نہیں
دیوتا کے بھگتوں میں نہیں
میرا غم یہ ہے کہ برسوں پیشتر
ایک کا غم سب کا غم ہوتا تھا سب
ایسے عالم میں نظر آتے تھے یکسر احتجاج

آج کیوں یہ اپنا سرمایہ ہنیں
میرا غم بس اس قدر ہے ساحلی بستی پہ جو ٹوٹا صعوبت کا پہاڑ
کیوں مرے احساس پر اس کا اثر رائی برابر بھی ہنیں ۔ ۔ ؟

حواشی:

قدیم تاریخ میں یوں بیان ہے کہ عراق میں فرات کے کنارے ایک شہر شوری پک آباد تھا ۔ جب وہاں آسمانی دیوتا آدو کا عتاب آبی طوفان کی شکل میں نازل ہونے کو تھا تو وہاں کے زمینی دیوتاؤں نے شوری پک کے لوگوں کو اشتباہ کیا کہ بہت بڑا طوفان آنے والا ہے ۔ اپنے اپنے گھروں کو توڑ کر ایک طویل کشتی بنالو ۔ اپنے ساتھ ہر شے کا بیج رکھ لو اور ہر ذی روح کا ایک جوڑا ۔ جب آدو کا عتاب نازل ہوا تو اس قدر شدید تھا کہ دھرتی کے دیوتا مارے خوف کے آسمانوں پر چلے گئے ۔ عشتار دیوی نے آدو کو اس ظلم سے روکنے کے لئے نوحہ کیا ۔ روئی گڑگڑائی ۔ لیکن اس کی کوشش ناکام ہوئی ۔ نیبو اور شارو دونوں آدو دیوتا کے پیش پیش تھے ۔ منو اہل ہنود کا دیوتا ۔ ہندو دیو مالا میں منو کے ساتھ بھی کم و بیش بالکل یہی واقعہ گزرا ہے ۔ وہاں مچھلی کے روپ میں وشنو دیوتا نے چیتاؤنی دی تھی ۔

مہاجر اور انصار

ہجرت کرنے والے ہزاروں لاکھوں لوگو!
حد سے زیادہ خود سے پیار بھی زہر ہوا ہے
کوئی زبان بھی غیر نہیں ہے
سب کا ایک ہی سر چشمہ ہے
جو بھی قدر نہیں کرتا ہم عصر زباں کی
اپنی زباں کا دوست نہیں ہے

ہجرت کرنے والے ہزاروں لاکھوں لوگو!
(سب تو نہیں، تم میں سے اکثر)
مٹی کی خوشبو سے نامانوس ہو اب تک
دھرتی سے جب لہرا اٹھتی ہے
جانے یا انجانے اس کی راہوں کے پتھر بنتے ہو
خود کو کنارہ کش رکھتے ہو
ساحل کی صورت میں تماشائی ہوتے ہو
افواہوں کے جنگل میں لیتے ہو پناہیں

نئے نئے خطرات کے وہم میں پھنس جاتے ہو
ڈر جاتے ہو گھبراتے ہو
شاخ نشیمن چھوڑ کے تم کرتے ہو اڑ جانے کی باتیں
تیاگ، فرار کی بات سے من کا بوجھل پن ہلکا کرتے ہو
ہجرت کرنے والے ہزاروں لاکھوں لوگو!
ترک نشیمن میں تم اپنا حل مت ڈھونڈو
اس کا کوئی انت نہیں ہے
خود کو لب ساحل کا تماشائی نہ بناؤ
مٹی کی خوشبو سے اپنا رشتہ جوڑو
جذب کرو لہروں کا ترنم
موجوں کے ہمدوش چلو اور دریا کی آوازوں پر لبیک کہو تم

دریاؤں کے دیش کے باشی!
پھولیں پھلیں ترے کھیت اور چاشی
جیئں ترے بہزاد اور مانی[۱]
امر رہے لالن کی بانی
تیری یہ تاریخ رہی ہے
تو نے ہر اک آنے والے کو اپنا سمجھا
بڑھ کے اسے سینے سے لگایا
خان جہاں[۲]، اشرف[۳] تو امہ

بلخی اور علی بغدادی

جو بھی تیرے، جہاں میں آئے
تیرے ہوئے، تیرے کہلائے

تیرا دل دریا ہے سدا کا
اور یہاں ہر آنے والا
اس دریا کا ہے اک قطرہ
قطرے کی دریا سے جدائی بے معنی، بے قدر و قیمت
قطرہ جب دریا سے جدا ہوتا ہے تو کھوتا ہے قوت
اس سچائی کا ہم میں سے اکثر کو ادراک ہے، لیکن۔
کچھ ایسے ہیں
قطرہ اور دریا کے رشتے سے ہیں ابھی تک ناواقف سے
رفتہ رفتہ وہ بھی اسے محسوس کریں گے
رفتہ رفتہ وہ بھی اس پر صاد کریں گے
دریاؤں کے دیش کے اے دل دریا باشی!
اپنے دل کے دروازے کو کھولے رکھنا
اسی میں تیری عظمت کا اسرار نہاں ہے
اسی سے تیری چاہت کا اقرار عیاں ہے
یہی ہے تیری امر بڑائی
یہی ترا آدرش قدیم!

ہر قیمت پر اس آدرش کے پرچم کو لہراتے رہنا

حواشی:

۱۔ خاں جہاں، ایک بزرگ اور جنرل تھے جنھوں نے کھلنا اور جیسور کے علاقے کو فتح کیا تھا۔ باگرہاٹ کی ساٹھ گنبد مسجد انہی کی بنائی ہوئی ہے۔
۲۔ یہ اپنے وقت کے بہت بڑے عالم، فقیہہ اور بزرگ تھے۔ انہیں بادشاہ وقت کے حکم پر بادل ناخواستہ دلی چھوڑ کر سونار گاؤں ڈھاکہ آنا پڑا تھا۔ حضرت مخدوم شرف الدین یحییٰ میزی بائیس برس تک ان کے ساتھ رہے اور تمامی علوم حاصل کئے اور انہیں کی صاحبزادی سے شادی کی۔
۳۔ ان کا مزار بوگرا مہااستھان میں ہے۔ یہ بلخی ماہی سوار کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔
۴۔ علی بغدادی کا مزار میرپور ڈھاکہ میں ہے۔ ہر روز یہاں سینکڑوں ارادت مندوں کا ہجوم رہتا ہے۔

ہوا

ایسا کہاں دیکھا تھا پہلے موسم کا بیوہار
پل کے پل میں مٹ جاتا ہے ہنستا بستا گاؤں

ریت گھروندے کی صورت اڑ جاتا ہے گھر بار
قاتل بن کر منڈلاتی ہے اپنی چھت کی ٹین

اپنے جگر میں گڑجاتا ہے اپنا ہی شہتیر
زخمی کر دیتے ہیں تن کو اپنے خس و خاشاک

پلک جھپکتے ہو جاتے ہیں ملبوں میں مدفون
نغمہ ، خوشبو ، کونپل ، ممتا ، چاہت پیار سنگھار

ایسا کہاں دیکھا تھا پہلے ہم نے ہوا کا رنگ
خوشبو کی کبھی لہر کبھی ہے تیغ کی دھار ہوا
کبھی پنگورا اور کبھی ہے تختہ دار ہوا
جیسے کسی پاگل ہاتھی کا آلہ کار ہوا
جیسے مہا کالی کے روپ کا ہے اوتار ہوا

ابر

کل تھے جس شاخ پر غزل خواں ہم
دیکھ کر میگھ کو ہوا پہ سوار
تن بدن میں حسین ملاروں کے
آنچ سی ناچ ناچ جاتی تھی
جھولے سجتے تھے پینگ اڑتی تھی
انگ کا نقشہ ، پیرہن کا سرور
شاخ در شاخ عام ہوتا تھا
پیار کا اہتمام ہوتا تھا
آج جس شاخ پر بسیرا ہے
دیکھ کر آسماں کے آنگن میں
بال کھولے ہوئے گھٹاوں کو
ناگنوں کا سروپ ابھرتا ہے
دل کا ایوان ڈول جاتا ہے
ذہن میں خوف رینگ پڑتا ہے
سایہ مرگ سرسراتا ہے
آشیاں کیا بدل گیا اپنا
موسموں کا مذاق بھی بدلا
منظروں کی نگاہ بھی بدلی

تم سمندر تھے

تم سمندر تھے
بنے دریا تو دریا ہی رہو
تم سے جو آکر ملی تھیں آب جوئیں
تم سے جو نکلیں ہیں شاخیں
ان کی سیرابی میں دریا دل بنو
پھر سے یہ سعی کرو
کہ دل تمہارا بحرِ بے پایاں بنے
اپنائے قلزم کا مزاج
تم سمندر تھے، بنے دریا تو
دریا ہی رہو
نالے کی صورت مت بہو
ماہیِ شہ زور و قد آور کا گنجینہ رہو
مینڈک کا مسکن مت بنو !

تقسیم

ایک گھر میں دو گھروں کی یوں ہوئی تقسیم
حائل ------ بانس کی دیوار
جیسے اک حجاب درمیاں
جب تلک تھا یہ حجاب درمیاں پنبہ بگوش

دونوں گھر اک دوسرے پر آئینہ ہوتے ہوئے بھی تھے نہاں
روز و شب اک دوسرے کی بات سنتے تھے
مگر انجان تھے
لمس لب کی صوت
پہلو کے بدلنے کی صدا
سرگوشیاں -------- سرگوشیوں کی احتیاط
ہر طرح تھی پردہ پوش
ہر طرح تھا اس حجاب درمیاں کا احترام
اس حجاب درمیاں کو کان جس دم ہو گئے
گوش بر آواز پھر محراب و در رہنے لگے
سانپ آوازوں میں لہرانے لگے
نزع کی صورت نمایاں ہو گئی
دونوں گھر اک دوسرے کے سامنے ننگے ہوئے
دونوں گھر اک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوئے

اپروٹڈ

میں جڑ سے اکھیڑا ہوا اک مسافر
وہاں آپڑا ہوں
جو اک شہر بے شخصیت ہے
جہاں آدمی زاد کا ایک جنگل رواں ہے
مکیں سے مکاں تک
ہر اک خواب پرواز کی دیکھنے میں مگن ہے
ہر اک کو عمومی سفر کی لگن ہے
کھڑا کون ہے آزو بازو
خبر ہی نہیں ہے
ہر اک راہ پر ہے دُرت کا تماشہ
بلمپت اسی بھیڑ میں کھو گئی ہے
میں اس بلدہ اجنبی میں کبھی جب
کہیں سر چھپانے کو پاؤں ٹکانے کو کوشاں ہوا بھی
تو ایسا لگا کہ معلّق ہوا ہوں!

"سمندر اور قطرے"

زمانہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء (سقوط ڈھاکا) تک

"بلا سے وہاں کچھ بھی ہو حشر اپنا
درختوں کے سائے ہوں یارہ گزر ہو
ہر اک لمحہ سر پر نہ تلوار ہوگی
سبھی اپنے ہوں گے
سکوں سے جئیں گے"
مری ماں تھی ہجرت کے حق میں، ہمیشہ
مگر میرے ابّا سیاسی نظر سے مخالف تھے اس کے
مری ماں کے آگے
مرے باپ کی آگہی سر بہ خم تھی
سیاست اپاہج
اور ہم ان کی باتیں سمجھنے سے قاصر
یہی جانتے تھے نئے دیس جانا ہے
اور لفظِ نوا اپنی خاطر سدا پُر کشش تھا

نئے پیرہن کا تصور مری رات سے خواب تک چھین لیتا تھا
مارے خوشی کے۔
نئے دیس آئے تو ہر چیز سے اجنبیت عیاں تھی
وہ موسم تھے
یا لوگ تھے یا زباں تھی
درختوں کے سائے کہ ہوں ریل ڈبے کہ ہوں پلیٹ فارم
ہماری طرح کارواں کارواں لوگ بکھرے ہوئے تھے
مگر ان کو بکھراؤ کا غم نہیں تھا۔
بڑے مطمئن تھے
انھیں یہ خوشی تھی کہ ان کی زمیں بھی
نئے دیس کا ایک بازو ہوئی ہے۔

- - - - - - -

نئی زندگی کی ہوئی ابتدا تو
درختوں کے سائے سے "کوارٹر" میں آئے
مرے باپ نے اپنا دفتر سنبھالا
مری ماں کو راس آئی گھر اور گرہستی
میں کر دی گئی مدرسے کے حوالے
محلے سے تھا مدرسے تک یہ عالم
کہ ہم باہری چند تھے۔ یعنی قطرے کے مانند
مقامی تھے اک جھاگ اڑاتا سمندر

یہیں پہلے پہلے مرے دل میں پیدا ہوئی تھیں کریدیں
سمندر سے قطرے کا کیا ہوگا رشتہ؟
سمندر سے قطرے الگ کس طرح جی سکیں گے؟
یہیں پہلے پہلے مرا ذہن مجھ سے سوالی ہوا تھا
نئے دیس کی اک زباں کیسے ہوگی؟
جہاں، ہم ہیں اس شہر و قریہ کے باشی
کریں گے قبول اس زباں کو بھی کیسے؟
جو ان کے لیے یک قلم اجنبی ہے۔
مگر طفل ذہنی مری اس سے آگے نہیں بڑھ سکی تھی،
مرے باپ کی دین تھیں، میرے اندر کُریدیں
مرے باپ کی آگہی، راست فکری کا مجھ پر اثر تھا
کئی ان کی باتیں گرہ میں بندھی تھیں
کہ ہیں سب سے اوّل، ہم انسان بیٹے
یہی آدمی کی ہے پہچان بیٹے
مذاہب سبھی اس کی تبلیغ میں، ہم نوا ہیں

محلے سے باہر تو جاتی نہیں تھی
کہ کم عمر تھی اور فضا اجنبی تھی
محلے کے اندر سکھی اور سہیلی سے ربطوں میں رہبر تھیں ابّا کی باتیں،
مرے حلقہ ربط میں باہری بچیوں کے علاوہ

مقامی میں، سلمیٰ، انوپورنا تھیں
مجھے ملنے جلنے میں ان سے تکلف نہیں تھا۔
کھلے دل سے ملتی تھی اور کھیلتی تھی۔
مگر میری ہی طرح کی دوسری بچیوں میں جھجک تھی۔
انھیں میری سلمیٰ، انوپورنا کی یہ سنگت نہ بھاتی تھی
------اور معترض تھیں
کبھی روٹھ جاتیں۔
کبھی دیتی تھیں مجھ کو قطعِ تعلق کی دھمکی۔
(یہی بات ان کے بڑے بولتے تھے)
مگر میں نے رکھی روش اپنی قائم
کہ ابّا کی باتیں مری رہنما تھیں

نیا ملک ----جس کی سیادت کا ثمرہ تھا۔ وہ رہنما جب
سرِ منبر قوم ڈھاکے میں آیا تو ڈھاکہ خوشی سے نہ پھولے سمایا
کیا اس نے یوں قومِ نو کو مخاطب
"مرے ہم وطن اب بہ فضلِ الٰہی
حصولِ وطن کا وہ خواب آپ کا اپنی تعبیر سے آشنا ہو چکا ہے۔
اور اب جبکہ تعمیر کرنی ہے شانے سے شانہ ملا کر
مناسب ہے اس کا اعادہ بھی کرنا
کہ جب ہم ہیں اک قوم و مسلک کے داعی

توقومی زباں ایک ہوگی ہماری"

یہ سن کر سرجلسہ اک کرب ابھرا

خدوخال جس کے نمایاں بہت تھے

مگر دب گیا نشۂ سرخوشی حصول وطن میں

کہ یہ سرخوشی سالہا سال کی جہد کا اک صلہ تھی

مگر جلد ہی ۔۔۔

پھر یہ لوگوں نے دیکھا

یہی کرب چہرہ بہ چہرہ

نکھرتا، سنورتا

سرراہ آیا

لہو میں نہایا ۔۔۔

منائی گئیں اس کی جب یادگاریں

سرشہر یہ دیکھنے میں بھی آیا

سمندر کے بیٹے مدارس سے اپنے نکل کر سرِرہ گزر موج زن ہیں ۔

سمندر کا چہرہ عتاب آفریں ہے ۔

مگر "چند قطرے" مدرسے کے دیوار و در سے ہیں چمٹے

سبق پڑھ رہے ہیں ۔

سمندر کے جذبات کیا ہیں ؟

سمندر انھیں کیا صدا دے رہا ہے ؟

صدا پر نہ ان کو، ----

نہ ان کے بزرگوں کو ہے کان دھرنے کا یارا۔

انھیں "چند قطروں" میں اک میں بھی تھی

چاہتی تھی

لگا کر چھلانگ اس سمندر میں کودوں

سجالوں سمندر کے چہرے کی سرخی کو اپنی جبیں پر۔

نیا ملک دو بازوؤں میں بٹا تھا

جو اک مشرقی، دوسرا مغربی تھا

نئے ملک کے بازوئے مشرقی میں

خلا ہی خلا تھا۔

نہ کل، کارخانہ، نہ صنعت کدہ تھا

نہ سرمایہ تھا اور نہ سرمایہ کاری سے اس کا مزاج آشنا تھا

جو مغرب سے سرمایہ کاری کے ہوشیار آئے

تو وہ کسبِ نفع کے دیرینہ کردار لائے

ملیں جب کھلیں، کارخانے چلے ان کی سرکردگی میں

تو یہ پیش آیا۔

کہ کام ایک سے

کام گار ایک سے

اُجرتیں مختلف ہیں

جو تاجر قبیلے سے ہیں ان کی اجرت اگر چار سو (۴۰۰) ہے
تو باہر سے آئے ہوؤں کے مقدر میں اس کام کے واسطے --
اس سے آدھی رقم ہے
مقامی کی قسمت تو اس سے بھی کم ہے
نتیجے میں نیچے سے کم اجُرتی کی جو بے چین لہریں ابھرتیں
وہ اوپر پہنچنے سے قاصر رہا کرتی تھیں اس سبب سے۔
کہ تھی بیچ میں اس کے دیوار حائل!
یہ دیوار کا بھی عجب سانحہ تھا
کہ ہر دور میں اس کے اکثر کو دیوار ہی رہنا بھایا
کبھی بھی انھوں نے، نہ دیوار کے بند روزن ہی کھولے
-- نہ باہر ہی جھانکا

کئی سال تک یہ نیا ملک "نوزائیدہ" تھا
بہ الفاظِ دیگر فرشتہ
فرشتے سے کچھ پوچھ گچھ کیا
فرشتہ تو پھر ہے فرشتہ!
غلط کام سے اس کا رشتہ ہی کیا ہے؟
کسی نے ذرا اس پہ انگلی اٹھائی
تو اکثر کی نظروں میں مشکوک و مطعون ٹھہرا
فرشتے کے خالق خداوند سارے

کہیں گہہ سے اس کے لئے نکلے لعنت کا طومار لے کر
اسے ملک دشمن، کمیونسٹ غدار کہہ کر پکارا
ستم یہ کہ اس میں، ہماری صدا تھی خطرناک حد تک
---- نکلتی ہوئی سی نمایاں نمایاں
کہ ہم چند قطرے وفادار ہیں
بے وفا ہے سمندر -----!

مرے ابا تھے - اس ادا سے پریشاں
مرے ابا کی اس پہ تنقیدیوں تھی
"ہمارا ہر اک جا یہ دیوار کی طرح کھنچنا ابھرنا
ہمارا رویہ کہ ہم ہی ہیں "محبوب بندے خدا" کے
وفا پیشگی معتبر ہے، ہماری
ہمارا سمجھنا کہ ہم ہیں نشاں دار تہذیب اعلیٰ
ضرورت سے بڑھ کر یہ فخر و مباہات، ہر پل
ہر اک بار اس کا اعادہ
کہ یہ ملک تو ہے، ہمارے لہو کا کرشمہ
تخن ہیں یہ سب فاصلے کے
غلط سمت میں جا رہے ہیں
نتائج بڑے اس کے سنگین ہوں گے"

ہمارا رویہ!

عجب دیدنی تھا۔

مقابل ہوئے کھیل میں جب بھی بنگال و پنجاب رجمنٹ

تو بنگال کا دل بڑھانے کی خاطر وہی چند بنگالی فوجی کا غوغا

مگر سارا مجمع تماشائیوں کا (مرے ہم زباں کا)

طرفدار پنجاب رجمنٹ کا تھا

تمام ان کے جوش اور بڑھاوے کی باتیں انھیں کے لیئے تھیں۔

ہمیں چاہیے تھا کہ کھیل اور کھلاڑی کی بنیاد پر داد دیتے۔

(کہ بنگال رجمنٹ کا کھیل اچھا کھلاڑی بھی بہتر)

مگر ہم کبھی ایسا کیوں، کر نہ پائے؟

نئی مملکت کے ضرورت سے بڑھ کر وفادار بندے

خداوندان کے

یہ رکھتے ہیں مسلک، ثقافت کے رشتے کی کم جانکاری

انھیں شاید اس کی خبر ہی نہیں ہے

کہ مسلک اگر ایک ہو بھی تو کیا ہے

کہ ہم مسلکوں کی ثقافت جدا ہے

ثقافت قبول اور رد کے مراحل میں ہر دم رواں ہے

ثقافت کی تشکیل نسلوں کا قصہ ہے

اس کا زمیں سے تعلق ہے گہرا۔

یہ ہم میں سے اکثر نہیں جانتے ہیں
کہ مسلک زمیں کی زبان و رسوم و ثقافت سے مل کر
نیا روپ ہر ملک میں دھارتا ہے۔
نئی مملکت کے ضرورت سے بڑھ کر وفادار بندے
خداوندان کے

یہ تاریخ سے نابلد ہیں
یہ مٹی کی فطرت سے کم آشنا ہیں
یہ تاریخ سے نابلد رہنے کو عافیت، مصلحت جانتے ہیں
انھیں کم پتا ہے یا شاید پتا ہی نہیں ہے
کہ یہ سرزمیں، تند خو موسموں کی زمیں ہے
کہ یہ سرزمیں حریت پروروں کی زمیں ہے
غلامی کسی دور میں اس کو بھائی نہیں ہے
جو دریا ہیں وہ ہیں کنارے سے باغی
کنارے کے بس میں کبھی رہ نہ پائے
کنارے سے ہر دم نبرد آزما ہیں
سرِ صبح اک گھاٹ ہے اک جگہ پر
سرِ شام وہ زیرِ آب آگیا ہے
مزاج ان کا ہے کچھ عجب انقلابی
سدا اک نئے راستے کے سرائی

یہ موسم کا عالم
ابھی صاف مطلع
ابھی آسماں پر سحابوں کی وہ فیل مستی
ہواؤں کا وہ تندریلا
کہ پیڑ، آدمی، لاٹ، کھمبے، گھروندے
مقابل جو آئے وہ خاشاک کی طرح زیر وزبر ہے
یہ تاریخ ہے اس زمیں کی
کہ خلجی سے لے کر علی وردی خاں کے نواسے تلک
کم ہی ادوار ایسے
کہ جن میں رہا ربط مرکز سے اس کا
ہمیشہ تھی آزاد اور "آپ مختار" سلطان کی حکمرانی

نئی مملکت اپنی اس عمر میں آگئی تھی
جہاں چاہتی ہے طبیعت کہ دوڑیں، قلانچیں بھریں اور جھومیں
مگر اس نئی مملکت کے خداوند
اب بھی مصر تھے کہ نوزائیدہ ہے،
یہی چاہتے تھے کہ انگلی پکڑ کر چلاتے رہیں مدتوں تک
مگر جب نئی مملکت کی قلانچیں لگانے کی،
آزاد پھرنے کی خواہش ہوئی عام تو پھر
تضادات اُبھرے

تضادات بھی آسمان اور زمیں کے
تضادات نے قوم کو مملکت کی امنگوں کی پہچان دی۔
خود شناسی عطا کی
خداوندگان سیاست کے پیروں کے نیچے سے
دھرتی سرکتی نظر آئی تو یہ ہوا ان کی جانب سے ارشاد
"لوگو۔
ہم اس دور میں آچکے ہیں کہ اب ملک کو اپنے پیروں پہ
استادہ رہنا سکھائیں
اسے آپ چلنا سکھائیں
اس اعلامیے کی ظفر مندیوں کے لیئے ان سیاست گروں کے
گروہوں کے
نوبت بہ نوبت، ہر اک شخص نے نسخہ کیمیا آزمایا
مگر اس کی انگلی پکڑ کر گھمانے کی عادت کے باعث
اسے آپ چلنا نہ آیا۔

سیاسی مربّی کی ناکارگی، ملک کی ابتری سے
سبھی ملک کے لوگ تنگ آچکے تھے
ہر اک چاہتا تھا کوئی آئے اور ملک کو ابتری سے بچائے
ضمانت خوش آئند لمحات کی دے
دلوں میں اُمیدوں کی شمعیں جلائے

رخِ مملکت حُسنِ جمہوریت سے سجائیے

ترقی پسندوں نے جمہور کی رائے کو پیش رکھ کر
یہ منشور کی شکل میں دیں صلاحیں
نظامِ حکومت کی تنظیم ہو اس طرح ابتدا میں
کہ ہو دولت فرد محدود تر تاکہ اس کا بڑا حصہ عام آدمی کے
تصرّف میں آئے
زمینیں ہوں یا کارخانے، ملیں ہوں
سبھی پیداواری وسائل کا ہو بانٹ بخرہ مساوی
رہیں دسترس میں نگوں طالعوں کے
وسائل کی تنظیم و تہذیب اعلیٰ کی خاطر
مناسب یہی ہے کہ دونوں ہی بازو میں ربط اس طرح ہو
علاقے میں وہ آپ مختار ہوں اور
حکومت کا نظم و نسق خود چلائیں۔"

وطن کی سیاست، حکومت، تجارت پہ مغرب کا غالب اثر تھا
یہاں کی زمامِ سیاست پہ جو لوگ حاوی تھے، وہ جانتے تھے
کہ جمہوریت صرف نعروں میں ہو تو بہت ہی حسیں ہے
مگر اس کا اطلاق ارضِ وطن میں
مفاداتِ مغرب کے ہو گا منافی

مفادات مغرب کی سب ہی نگاہیں
تھیں ان ہی سیاسی مربی کے ہاتھوں کی زینت
انھیں یہ پتا تھا کہ جمہوریت اپنے سنگم میں آزاد بہنے لگی تو
پھر آبادیوں کے تناسب کے باعث
سدا بر سر اقتدار "اہل مشرق" رہیں گے
سیاست سے لے کر وزارت تلک
ان کے افکار بیدار کو باریابی ملے گی
اور افکار بیدار کی باریابی کا مطلب تھا
جمہور کا زور
فرسودگی کے اندھیرے میں
فکر و نظر کے اجالے کا پرچار
حاکم سے محکوم،
ظالم سے مظلوم کی رستگاری۔

بھلا جانتے بوجھتے کون اپنے گلے میں لگاتا ہے پھندا
تو جمہور کے رخ کے تیور کو خطرہ سمجھ کر
خداوندگان حکومت
حکومت میں بیٹھی ہوئی عملہ شاہی
زمینوں کے داتا، ملوں کے بدھاتا
بساط سیاست پہ کوئی نئی چال چلنے کے درپے ہوئے اور

ہوا دی، کبھی فرقہ وارانہ جذبے کو
اور پھر کبھی نیشنل ازم کی پیٹھ ٹھونکی
کسی تازہ ریشہ دوانی کی ٹھانی
کمیں گاہوں میں ان کے بیلوں کو باندھی ہوئی تنگیوں نے
زقندیں لگائیں
کہ رازِ وفا پیشگی ان کی مکتوم ہے اس روش میں
بالآخر اچھلتے، امنڈتے ہوئے سیلِ جمہور کی راہ میں
بند استادہ کرنے کی خاطر
سپاہی قیادت سرِ عام آئی۔

یہ وہ دور تھا جب میں اسکول کالج سے فارغ ہوئی ---
اور بیاہی گئی تھی،
سیاست کا اچھا برا، مجھ پہ کچھ اور واضح ہوا تھا۔
سپاہی قیادت سمندر کے چہرے پہ اک کرب لائی
مگر "چند قطروں" کی اکثر نگاہوں میں چھائی ہوئی تھی
خوشی کی خدائی
سپاہی قیادت سرِ عام آئی تھی یہ عہد کر کے
کہ وہ ملک کو اپنے قدموں پہ ٹکنا
اسے آپ چلنا سکھائے گی۔ لیکن ہوا یہ
کہ اس عہد کو لگ گئی ایسی دیمک

جب ہم کہیں عرف میں منفعت کوشیوں کے پنگورے کا
پروردہ طبقہ
یہاں کی معیشت پہ تھیں جن کی بے جا گرفتیں
سپاہی کہ جن کا تھا کارِ مقدس
حدود وطن کی حفاظت
وہ اب ہو گیا تھا سیاست میں داخل
سیاست کی آلائشیں اس کے دامن کو کب چھوڑتی تھیں
سپاہی قیادت چلی تھی جو یہ عہد لے کر
کہ آداب جمہوریت سے کرے آشنا مملکت کو
اسے آپ جینا سکھائے
وہ خود اپنی رفتار بھولی
لگی چلنے وہ منفعت کوش طبقے کی انگلی پکڑ کر
یہی وہ زمانہ تھا جب "اہل مشرق" کے ذہنوں میں
یہ سوچ اک سانپ کی طرح سے سرسرائی
بھلائی اسی میں ہے مشرق کی، مغرب سے ہو جائے یکسر علاحدہ
تو اس نظریے کے طرفدار، بگلا بھگت سب ممالک
عناصر، عوامل
جو تھے ایسے حالات کے انتظاری
جو اس کے لیئے راہ ہموار کرتے رہے تھے۔
جو اس کے لیئے سازشیں گھڑ رہے تھے۔

کوئی سامنے

کوئی پردے کے پیچھے

لگے ہر طرح کرنے قوت فراہم

مزہ یہ کہ ان سازشی سرغنوں میں

نئی مملکت کے عیاں دشمنوں کے علاوہ

حلیف اور پرستار بھی تھے

نیا نظریہ

"قومیت" کا تھا پرچار

اگر ہو یہ فطرت میں وسعت بداماں

تو ہے ایک راحت

اگر یہ مقاصد میں محدود تر ہو

تو ہے اک خباثت

حقیقت یہ تھی کہ نئے نظریہ میں خباثت کا پلہ تھا بھاری

خباثت کی بانبی میں تھے عصبیت کے سنپولے۔

نئے نظریہ کی زیاں کاریوں سے سنبھالے کی خاطر

سپاہی قیادت نے گو ہاتھ بدلے

مگر ہاتھ کے بدلے جانے سے حالت بدلتی ہے کیا اس

فضا میں؟

بدل دیں اگر اس کا مشروب، کیا ہے؟ کہ بوتل وہی تھی،

سپاہی قیادت کے اس نقش ثانی کا تھا نقش اول سے
بس فرق اتنا
خریدا تھا اس نے قلم کو سلیقے سے
اس نے کیا یک قلم رد سبھوں کو
خبر پر مسلط کیا ایک روباہ کو شیر کا نام دے کر
کھار اس کا کہتے ہیں باہر کہیں تھا۔
اور اس کے سبب سے
تھی سرکار سے لے کر اخبار تک کالی سوچوں کی یلغار
اور آگہی اور بصیرت
دفاتر سے خبروں کے باہر نکل کر
سرکو و برزن، پکوڑوں کا بیوپار کرنے پہ مجبور ہو کر رہی تھی
کہ گھر بار کے فاقہ مستی سے بچنے کا رستہ یہی تھا

ادھر سارے اخبار کی سرخیوں، کالموں کے عجب کچھ تھے تیور
کبھی انڈونیشی روایات خونی کے دہرائے جانے کی تھی پیش گوئی
کبھی حشرِ سوکارنو کی تھی اہل بصیرت کو دھمکی
کبھی فارلینڈ، اس کی آمد کے چرچے
نئے نظریہ کی زیاں کاریوں سے سنبھالے کی خاطر
الیکشن کی صورت میں موقع ملا بھی
مگر کالی سوچوں کے سارے درونی، برونی طرفدار

-----اخبار

ہالی موالی کے، بر خود غلط مشوروں کی وجہ سے
سپاہی قیادت کے تبدیل ہاتھوں نے کچھ بہتری کا بھی موقع گنوایا۔
غرض یہ کہ کالے کو اور کالی چادر اڑھائی
نتیجے میں قطع تعلق کا طوفان آیا
سمندر نے لاکھوں ہی امواجِ سرزور کا روپ دھارا
سپاہی قیادت کا یہ نقشِ دیگر سرراہ طوفان کو روکنے کے لیے
دندنایا
نئے نظریہ کے درونی برونی سبھی سازشی سرغنوں، عصبیت
کے سنپولوں نے
رستہ سجھایا۔
"غنیمت ہے موقع
"رہے بانس اور نہ رہے بانسری" کا طریق آزمالو
لسانی فصیلیں جو ہیں اس معیشت میں بھی بالادست
اس کو ڈھالو۔
یہ اک پنتھ دو کاج ہو گا
تو ردِ عمل میں اک آواز اُبھری
وہ آواز جو پیر سالی کے باوصف
تھی حوصلے میں جوانوں سے بڑھ کر
جڑیں اس کی مٹی میں گہری بہت تھیں
وہ آواز لاکھوں دلوں کی تھی دھڑکن

وہ آواز یہ تھی۔

"مرے دیس بند ھو، مرے اپنے لوگو

جو دیوار ڈھانے کی تم سوچتے ہو

وہ دیوار اور اس کے سائے میں سب بسنے والے

وہی اصل میں ہیں یہاں "سربوہارا"

مسائل ہیں تم سے بھی گمبھیر ان کے

مرا ایسی سوچوں سے ناتا نہیں ہے

جو دیوار ڈھانے پہ اکسا رہے ہیں

تمھیں دوست، دشمن کی پہچان سے دور لے جا رہے ہیں

تمھیں اصل مقصد سے بھٹکا رہے ہیں۔"

مگر کون سُنتا تھا "حق کی کتھا" کو

کہ باطل یہاں تانڈو ناچتا تھا

درونی، برونی سبھی سازشی سرغنے دام در دام پھیلے ہوئے تھے

گرفت ان کی مضبوط تر ہو چکی تھی۔

بپھرتے سمندر کی ہر موج کو اسلحہ سے نوازا

نتیجے میں یہ اسلحہ بند قوت

بجھائی ہوئی راہ پر چل پڑی اور

سپاہی قیادت سے زور آزمائی سے پہلے

لسانی فصیلوں کو ہر شہر و قریہ میں ڈھانے کو نکلی

کئی شہر و قریہ تو ایسے ہوئے نیست و نابود

ہر ایک ذی روح سنگین کی زد میں آیا۔
ہلاکت کا اک "باب نو" "چند قطروں" کے حصے میں آیا۔

انھیں میں سے اک شہر تھا میرا مسکن
یہاں اسلحہ بند قوت نے جب قتل کی ابتدا کی
سرِ شہر قاتل کے رحم و کرم پر
مری طرح کے سارے افراد ہی قتل کے منتظر تھے
میں اس دم بھرے گھر کی ملکہ
پرستار اجمل کی بیوی تھی
نو خیز اختر کی ماں تھی
بھرے گھر کی جنت میں رہ بس رہی تھی۔
وہ قاتل سرِ شب جو سنگین تھامے در آئے
وہ انجان بھی تو نہیں تھے
کئی ان میں سے آشنا تھے
تلاشی لی گھر کی
بڑی ہی شقاوت سے سنگین اجمل کے سینے میں گھونپی
عجب کرب میں مانگتا تھا وہ پانی
مرے سر پہ تلوار لٹکی ہوئی تھی
بڑھے جب یہ نو عمر اختر کی جانب
تو وہ بھاگ کر میرے سینے سے چمٹا

شقی نے اسے کر دیا قتل سینے پہ میرے
دم قتل اس کے عجب نرخرے کی صدا تھی
مرے ساتھ بعد اس کے کیا پیش آیا؟
خدا جانتا ہے
ہوا جب گجر دم چلی تو مجھے ہوش آیا
میں لاشوں کے انبار میں ایک دریا کنارے پڑی تھی
مری طرح اور سینکڑوں عورتیں زخم کھا کر لہو میں تھیں غلطاں
بہت ان میں سے جاں بہ حق ہو چکی تھیں
نہ میرے
نہ ان کے
کسی کے بدن پر تھے کپڑے
زمیں، آسماں اور رستے لہو پیرہن تھے
میں لاشوں کے انبار میں زخم خوردہ بدن،
خوں شدہ ذہن سے سوچتی تھی
کہ ہم سے تو صدیوں پُرانی ان افواج کا وہ کماں دار بہتر
کہ تھا جس کے مشرب میں بے فرقِ صنف و سن و سال
مفتوح کو برہنہ تن تہہ تیغ کرنا
مگر وہ بھی اک ایسے مقتل میں آیا تو بے تاب ہو کر
عجب شرمساری کے عالم میں بائبل کے اوراق سے
۔۔۔ شرمگاہوں کو ڈھانپا

مگر ہم.......

سپاہی جو تھے اک تحفظ کا احساس "قطروں" کی خاطر
وہ خود اپنی جانیں بچانے کو اک شہر سے دوسرے شہر دوڑے
یہ مجبوریاں ان کی تھیں
یا کوئی مصلحت تھی
کہ جس شہر خوں ریز میں بھی گئے، بعد مردن گئے وہ
نئی مملکت کی سیاست اب اس نزع کے موڑ پر تھی
کہ تھا اُس طرف سر اٹھاتا، امنڈتا، بپھرتا سمندر
سمندر سے ملتے ہوئے شاخ در شاخ دریا
ندی
جھیل
جھرنے
ادھر ساحلوں پر تھیں حرکت میں آئی ہوئی موج در موج فوجیں،
سفینے سفینے تھا بکھراؤ ان کا
سمندر کو دہشت زدہ کر رہی تھیں،
ہر اک سمت تھا آگ، خوں کا تماشا
جو فوجوں کو دہشت کے بل پر ہوئی عارضی کامیابی
تو اکمل سمجھ کر
ہوئے رونما منفعت کوش طبقے کی زنبیل سے ایسے

افراد سارے
چمکتے ہیں چہروں سے. بڑھ کر کہیں جن کے خرقے، عمامے
وہ خرقے جو ہر دور میں مختلف روپ بھر کر۔۔۔
رہے آگہی کے مخالف
جو تھا دورِ شاہنشہی تو مفاداتِ شاہی کے تھے پشتباں وہ
سنگھاسن کے پائے سے لپٹے ہوئے تھے
جو سرمایہ داری نے شاہنشہی کی جگہ لی
تو سرمایہ داروں کے تھے یہ حواری
جو آئے سپاہی قیادت کے ادوار تو وہ
سپاہی کے کندھے پہ بیٹھے ہوئے تالیاں پیٹتے تھے
کہیں ملا شور اور کہیں تھے یہ آیت
کہیں عقل کل تھے یہ مسجومیوں، ہندتوں کے
یہاں پر بھی خرقوں، لبادوں نے مانگی بصیرت سے مخمور ہو کر
سپاہی کی وقتی ظفر مندیوں کو سراہا
۔۔۔ بنے "شاہ بالا"
سمندر کی بستی پہ اپنے اثر،
اپنی خود ساختہ اہمیت کا دلایا یقین اور
سراب خاشاک تھے، فوجیوں کو مگر مثلِ آہن بتایا۔

کسی غیر اشارے پہ البدر، الشمس کا ایک خوش وضع نقشہ بنایا

تعاون کا بھڑکیلا چہرہ دکھایا
حکومت کے فرمان کی چھاؤں میں پھر
دبے پاؤں صوبائی نظم و نسق میں در آئے
تعاون کے بھڑکیلے پردے کے پیچھے
بڑی ہوشیاری سے مطلب برآری کی خاطر
سپاہی کے کندھوں پہ بندوق رکھ کر
کمیں گہہ سے اپنی چلے یہ پرانے خرد کے شکاری
لیے ہاتھ میں اپنے البدر، الشمس کا سبز جھنڈا
چھپائے ہوئے آستینوں میں خنجر
پھر آنکھوں نے دیکھا
ہر اک شہر و قریہ میں شب خوں کی صورت میں ---
خوں ریز منظر
کہیں قتل تھے آگہی کے شناور
کہیں خوں میں لت پت تھے فہم و فراست کے مہتاب پیکر
کہیں ڈھیر تھے ارتقا کے پیمبر
یہ سچ ہے خرد دشمنی، آگہی کشتنی
---ان کی ریتیں پرانی
مگر یہ بھی سچ ہے
سدا چڑھتے سورج کے سائے میں یہ پلنے والے

خرد دوستوں کے مقابل

صف آرا ہوئے

مات کھاتے رہے ہیں

مرے گھر کے اس بانٹ بخرے میں

میرے بیرونی حلیف اور حریف ایک ہی طرز سے سوچتے تھے۔

مرے گھر کا بھیدی بھی اس باب میں ان کا ہی ہم نوا تھا

جو تھا فرق دونوں کی سوچوں میں یہ تھا

حلیفوں نے حل میز پر اس کا چاہا

حریفوں نے اس کے لیئے جنگ سوچی

مگر گھر کا بکھراؤ اپنے پرائے سبھی چاہتے تھے

تو پھر کون اس کو بکھرنے سے آخر بچاتا۔

بہ قول سمندر سحر آچکی ہے۔

جو چاہا تھا اس کو وہ سب مل گیا ہے

مگر وہ جو قطرے

زمانہ ہوا اس سمندر کی بستی میں،

آدرش کے واسطے اپنا گھر بار سب چھوڑ کر آبسے تھے

وہ آج اپنے اس گھر میں بے گھر ہوئے ہیں

مری ماں مرے باپ سے کہہ رہی ہے

وہ غم ان کا ہو یا ہمارا

برابر ہیں دونوں
مگر ان کے غم کو سحر مل گئی ہے
لہوان کا جو کچھ بہا اس کا وہ خوں بہا پا چکے ہیں۔
اور ہم۔
رہ گزر رہ گزر آل اولاد کے ساتھ مارے گئے تو
ہمیں خوں بہا اس کا اک اور مقتل کی صورت ملا ہے
غم اپنا غم رائیگاں بن گیا ہے۔"
کہا میرے ابا نے سچ کہہ رہی ہو
ہمارے لیئے اب یہ ممکن نہیں ہے کہ پھر اس میں
پودے لگائیں"۔
تو پھر کیا ارادہ ہے؟
میں تو کہوں
چل پڑیں ہم کراچی کی جانب"
مری ماں نے پوچھا"
وہ پھر خود ہی بولی
"بلا سے وہاں کچھ بھی ہو حشر اپنا
درختوں کے سائے ہوں یا رہ گزر ہو
ہر اک لمحہ سر پر نہ تلوار ہو گی
سبھی اپنے ہوں گے
سکوں سے جئیں گے۔"

ویگن آباد

حضرت والا اسے کہتے ہیں ویگن آباد
" دوڑتی پھرتی حویلی " کا نمونہ ہے یہ
" چلتی پھرتی ہوئی کالونی " بسانے کے لیے
جوٹ کے ریشمیں اجسام کے بدلے میں اسے
وال اسٹریٹ نے بھیجا ہے بطور تحفا
کیا کیا آپ نے ارشاد ---غلط کہتا ہوں
" دوڑتی پھرتی حویلی تو نہیں -- ویگن ہے "
آپ اسے جو بھی کہیں میری نظر میں ہے مگر
رینگتا پھرتا سرکتا ہوا " دولت خانہ "
آپ کو کیسا لگا " میرا یہ دولت خانہ "
سالہا سال کے خوابوں کی سنہری تعبیر
جہدو ایثار مسلسل کا حسیں تر حاصل
راہ گم کردہ مسافر کی طرح لائینوں کے
آہنی جال کے ماحول میں استادہ ہے
یہ بیک وقت ڈنر ہال بھی خلوت بھی ہے

اور طرب گاہ بھی ہے خانۂ راحت بھی ہے
لوگ کہتے ہیں کہ اس درد میں راحت بھی ہے
مجھ سے گر پوچھیئے تو " درد میں راحت " کے سوا
اک نئے دور کے آغاز کی سرحد بھی ہے
موسم گرما میں سورج کے نکلتے ہی یہاں
دھوپ کا جلتا ہوا جال سا تن جاتا ہے
ناچنے تیرنے لگتی ہیں شعاعیں ہر سمت
اپنے پہلو میں تمازت کی پھواریں لے کر
سامنے ٹوٹا ہوا ڈبا جو استادہ ہے
۸۶ جلی خط میں لکھا ہے جس پر
جس کے آغوش میں پھیلے ہیں منوں مٹی کے ڈھیر
آپ سے آپ اُگ آئی ہوئی ہریالی ہے
لچلچی ، لمبی ہری گھاس ، ہرے پودے ہیں
اور ہرے پودے کی نازک سی حسیں پھنگی پر
سر ہلاتے ہیں مچلتے ہیں کئی تازہ پھول
کئی منھ بند لجیلی سی نویلی کلیاں
جوں ہی دن چڑھتا ہے جل اٹھتا ہے حدت کا الاؤ
چلچلاتی ہوئی کرنوں کی لپکتی باہنیں
سامنے ڈبے کے منظر سے چمٹ جاتی ہیں
عارض گل کی نمی کچی کلی کا جوبن

ہری ٹہنی میں لہکتی ہوئی ننھی کونپل
پیکر سبز کی لچکیلی ، حسین رعنائی
آتشیں لہروں کی آغوش میں کھو جاتی ہے
ان ہی لمحات میں خوابوں کی حسیں تعبیریں
یعنی ویگن یہ نئے طرز کے دولت خانے
یک بیک آتشیں آغوش میں ڈھل جاتے ہیں
آہنی چھت در و دیوار سلگ اٹھتے ہیں
حدتیں ناچتی ، لہراتی ہیں بل کھاتی ہیں
اڑنے لگتی ہیں ہر اک سمت گھنیری آنچیں
فکر کا پنچھی ۔ تصوّر کی سنہری تتلی
عندلیبانِ محبت کی سہانی تخیل
ذہن کو دور ہی سے تکتی ہے اڑ جاتی ہے
اپنے سینے میں جگائے ہوئے یہ خوف و ہراس
جل نہ جائے کہیں خوش رنگ پروں کی پرواز
اپنا یہ حال کہ ماں باپ بہن بچوں سمیت
دھوپ کے تیروں کی بوچھار سے بچنے کے لیئے
ڈر سے صیاد کے بھاگے ہوئے پنچھی کی طرح
پہیوں کے سائے میں ہر روز دبک جاتے ہیں
صرف ہم ہی نہیں ہر روز ہزاروں انسان
چاروں پہیوں کے نشیمن میں سرک آتے ہیں

ایسے ماحول سے ہر لمحہ یہ اٹھتی ہے صدا
" زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے "

(۲)

اور برسات میں طوفاں کی مسلسل یلغار
باد و باراں کے گرجتے ہوئے پاگل جھونکے
میرے دولت کدے کی پھونس کی چھت کو اکثر
دست وحشی سے قلابازی کھلا دیتے ہیں
آہنی چھت کے نہ ہونے کے سبب سے جس کو
آہنی ڈبے کی دیواروں پہ منڈ رکھا تھا
زور طوفان کا اولوں کی تڑاتڑ بارش
بکس سے برتنوں سے لیمپ سے ٹکراتی ہے
تلملاتی ہوئی یہ لیمپ بکھر جاتی ہے
ظلمتیں کھولے ہوئے بال امنڈ آتی ہیں
یوں ٹنا ٹن کی صدا گونج کے لہراتی ہے
سامنے بنگلے کی پر نور فضا میں جیسے
کوئی نو مشق پیانو کے حسیں پردے پر
موج میں آکے یونہی انگلیاں رکھ دیتا ہو
اور اولوں کے گھنے حملوں سے بچنے کے لئے

پھیلتی ، بڑھتی ۔ سنکتی ہوئی تاریکی میں
دق زدہ بیوی پریشان ، بہن بچوں سمیت
تخت یا کھاٹ کے سائے میں سرک جاتے ہیں
زور طوفان کا ، بجلی کی کڑک تھمتے ہی
میرے ہی جیسے کئی اور پڑوسی میرے
بال بچوں کو لیے خانہ بدوشوں کی طرح
ناچتے گاتے ہوئے بنگلوں کی برساتی میں
شب گزاری کے لئے بھاگ کر آجاتے ہیں
دیکھ کر زیست کا یہ مہلک و بے رنگ تضاد
قہقہے ، گونج ، لہو رنگ کھنکتے ہوئے جام
کیف میں نشہ کے ڈوبے ہوئے نوریں در و بام
یک بیک ذہن کی کھوئی ہوئی پہنائی میں
سوچ کا جلتا ہوا موڑ ابھر آتا ہے
اک طرف بنگلوں میں ہے روشنیوں کی افراط
گھر کے ہر فرد کے رہنے کو الگ کمرہ ہے
بجلی پنکھا ہے ۔ مسہری ہے ۔ نئے سوفے ہیں
اور صوفے پہ چڑھائے ہوئے زرین غلاف
رقص ہے ، رنگ ہے ، تزئین ہے ، آرائش ہے
عیش ہے ۔ عیش کے اسباب ہیں خوش حالی ہے
اک طرف تیرگی کے جال میں پژمردہ سا

ویگن آباد ہے، پہیوں کی حسین خلوت ہے
آہنی فرش کی شبرنگ سی قالینیں ہیں
اس کی آبادی کے آسودہ طبیعت افراد
شوق سے ڈالے ہوئے جسم پہ عریانی کو
غم و آلام کی خوش رنگ حسیں جھاڑی میں
دلربا بھوک کے رومان بنا کرتے ہیں

(۳)

اور دسمبر کی گھنی چبھتی ہوئی سردی میں
میرا "دولت کدہ" ہر رات برائے تزئین
اوڑھ لیتا ہے معاً جیسے ردائے برفاب
جسم پر اپنے سجا لیتا ہے صدہا آلات
برف کی گود کے پروردہ ہوا کے جھونکے
اور جھونکوں کی اچھالی ہوئی نوک شمشیر
برف بردوش ہواؤں کی یہ سیل پرزور
بھول سے گر کسی انساں کے بدن سے چھو جائے
تار احساس اذیت سے تڑپ اٹھتا ہے
تھمنے لگتی ہے رگ و پے میں لہو کی گردش
جلد میں رینگنے لگتی ہیں نکیلی لہریں
کبھی ان لہروں کے برفیلے نکیلے اثرات

فوری تدبیر عمل کرنے سے مرجاتے ہیں
اور کبھی برف سی لہروں کی یہ تیزی تندی
جسم کو موت کے تاریک سیہ خانے میں
لوری دے کر ابدی نیند سلا دیتی ہے
آج دو سال سے ہر روز نئی بستی میں
کوئی بیوی ، کوئی شوہر تو کسی کا بچہ
پھول ارمان کے الفت کی لجیلی کلیاں
آرزوؤں کی ہمکتی ہوئی نازک کونپل
تیخ سی پھیلی ہوئی اس جھیل میں کھو جاتی ہے
اب یہ آلام ہیں برداشت سے باہر اپنی
اب ان آلام کے کانٹوں کو ہے گل کی حاجت
اب ان آلام کو راحت میں بدل دینا ہے
اب ان آلام کے مرجھائے ہوئے عارض پہ
غازۂ تازہ شفق فام ہی مل دینا ہے
دیکھئے دیکھئے بنگلوں سے وہ نغمے ابھرے
شب کی تاریکی میں تحلیل ہوئے بادہ و رنگ
رقص کرتی ہوئی چھا گل کی صدائیں اڈیں
مرد کے جسم سے چپکی ہوئی عورت ناچی
دیکھئے اُبھرا فضاؤں میں کراہوں کا ہجوم
دیکھئے ڈبّے سے مدقوق سے کھانسی لپکی

دیکھئے سامنے ویگن میں الاو لپکے
جسم کو سرد ہواوں سے بچانے کے لیئے
سرخ شعلوں نے نئے رنگ سے انگڑائی لی
کون جانے کہ یہی شعلے لپکتے بڑھتے
جھلملاتے ہوئے بنگلے کی فضا پر چھا جائیں
کون جانے کہ یہ چنگاری کی بے باک اڑان
رقص کرتی ہوئی چھاگل کی صدا کو چھولے

(۱۹۵۳ء)

غزلیں

کوئی سنگ دل بھی ہوگا جسے سن کے آبدیدہ
رگ ساز میں نہاں ہے وہ نوائے جاں کشیدہ
مجھے ہنس کے تم نہ دیکھو ہوں اگر خزاں رسیدہ
اسی شاخ پر تھے خنداں گل نوبہار دیدہ
جو ہے ناز ناز عنواں تو ادا ادا ورق ہے
ترا حسن دلربا ہے کوئی خوش نما جریدہ
کبھی دشت چشم و دل سے جو بہ شوق جلوہ گزرا
نظر آیا ہر قدم پر مجھے آہوئے رمیدہ
مرے شب گزیدہ دل کا جو علاج ہے تو یہ ہے
کسی غنچہ وش کے رخ کی کوئی صبح نودمیدہ
مرے غم کی رہنما ہے تری جرات تبسم
مرا راز سربلندی ترا حسن سر کشیدہ
مجھے دور ہی سے تکنا، مری روح تک نہ آنا
میں ہوں برگ ریز موسم تو بہار آفریدہ
اسے چھیڑنے سے پہلے ذرا تاب دل پرکھ لے
ہیں ابھی حجاب پردہ کئی درد ناشنیدہ
انہیں غم کے بازوؤں میں کھلے سرخوشی کے پہلو
ہوئے جنت نظر بھی بہی دامن دریدہ
کبھی تھی کہیں جن سے در و بام دل کی رونق
ہیں نصیب دشمناں اب وہی پھول چیدہ چیدہ

ہر کوئی چہرہ ہے اک پھیلا سوال
سرخی خونِ سے اسے کیجئے نہال

جن کی خاطر ہم لہو میں گڑ گئے
ان کے چہرے پر نہیں گرد ملال

خوش نما کتنا تھا آغاز سفر
کس قدر قاتل ہوا اس کا مآل

جان اندر ، ماہی بے آب ہے
بُن رکھا ہے استخواں کا گرد جال

پھر رہے ہیں جو پراگندہ معاش
کیوں نہ ہوں گے وہ پراگندہ خیال

بے بسی اپنی بھی ہے بے انتہا
اس کی طرز بے رخی بھی بے مثال

خاک اپنی جس کے زیر پا نہیں
اس کا مستقبل نہ ماضی اور نہ حال

خون ہے شاید کہ ارزاں از حنا
جس کو دیکھو کررہا ہے ہاتھ لال

کم نہیں یہ بھی مخاطب تو ہوئے
اس خوشی میں کہتے ہیں اچھا ہے حال

گھر کی دیواریں ہوئی ہیں ستر پوش
اب یہ ہے دیوار کے اندر کا حال

اور کے کیا کام آئے گا سہیل
اپنے ہی جب کام آنا ہو محال

نہ یہاں ہیں نہ وہاں ہیں ہم لوگ
کوئی سمجھائے کہاں ہیں ہم لوگ

ایک عبرت کا سماں ہیں ہم لوگ
کشتۂ سود و زیاں ہیں ہم لوگ

جو بھی معلوم وطن کرتا ہے
کہتے ہیں اشک چکاں ہیں ہم لوگ

جیسے اس شہر میں رہتے ہی نہ تھے
ایسے بے نام و نشاں ہیں ہم لوگ

خاک کے ڈھیر پہ لہراتے ہیں
جل بجھے گھر کا دھواں ہیں ہم لوگ

یاد اب یہ بھی نہیں ہے کب سے
رخت بر شانہ رواں ہیں ہم لوگ

شرحِ غم کے لیئے الفاظ نہیں
صورتِ عجزِ بیاں ہیں ہم لوگ

وہ بھی گھر تھا کہ جسے چھوڑ آئے
یہ بھی گھر ہے کہ جہاں ہیں ہم لوگ

خود کیئے ہی کا تو خمیازہ ہیں
کس لیئے رنج کشاں ہیں ہم لوگ

خیر ہی خیر مناتے ہیں سہیل
کس قدر نیک گماں ہیں ہم لوگ

دینے والے چند ہیں اور مانگنے والے ہزار
صدہا بیماروں کے حلقے میں ہے اک تنہا انار

چاہنے پر بھی کسی کے کام آسکتا نہیں
مفلسی پر آئی ہوگی کا ہے کو ایسی بہار

کوئی صورت جبکہ بخشش کی نکلتی ہی نہیں
ہے غبار وہم خاکم در دہن آمرزگار

کیجئے کس کو فراہم بے گناہی کا ثبوت
کون اپنے واسطے بیٹھا ہوا ہے عدل کار

ایک سی مشکل میں ہر اک اہل خانہ ہے گھرا
طرفگی یہ ہے ہر اک کو غیر کے گھر میں قرار

کچھ نہیں خواہش سہیل ہر شخص کی اس کے سوا
رخت میں مل جائے اس کو دفعتاً راہ فرار

جو رخ سے تمہارے مختص تھی اب عتقادہ مسکاہٹ ہے
جب طبع بھی ناساز نہیں پھر کیسی یہ پیلاہٹ ہے

جب ذہن کا دروازہ کھولو تو دور تلک ہے سناٹا
ہر لمحہ مگر یہ لگتا ہے کہ باہر کوئی آہٹ ہے

کیا پیڑ ایسے میں بھروسے کا پھل پھول بھلا دے پائے گا
ہر روز نیا ایک فتنہ ہے ، ہر لمحہ اک اکساہٹ ہے

سب لوگ وہی موسم بھی وہی پھر کیسا روگ لگا جی کو
جو بات کہ اچھی لگتی تھی اس بات سے بھی اکتاہٹ ہے

کچھ کھو سا گیا ہے لگتا ہے ، کیا کھویا کہنا مشکل ہے
اک اکھڑی اکھڑی صورت ہے ہر لمحہ اک گھبراہٹ ہے

جو چہرہ ہر دم کھلتا تھا ، ہر لمحہ کھلنے والا تھا
وہ چہرہ بے مفہوم ہوا ، اس چہرے پر جھلاہٹ ہے

کسی شے کے حصول پر اترانا ، اظہار خوشی کی صورت ہے
یہ ہوگی عبث اک بھول اگر سمجھیں سب کچھ اتراہٹ ہے

دریا سے ہے مٹی کی راحت دریا نہ حوالے کر دینا
مٹی کی رفاقت سے قائم دریا میں یہ لہراہٹ ہے

شہر کا شہر تھا مقتل جیسا
ہر صدا لگتی تھی قاتل کی صدا

سارے آدرش ہوئے چکنا چور
ہم بہاری تھے وہ بنگالی تھا

اپنی آواز سے ڈر جاتے تھے
غیر سا لگتا تھا اپنا سایا

ایک سے دونوں مگر اک قاتل
دوسرا قتل ہوا جاتا تھا

خون میں ڈوبی ہوئی تھی ساعت
کرب سے چیخ رہا تھا لمحہ

قاتل شہر معزز ٹھہرے
قتل میں فخر کا پہلو دیکھا

جی رہے ہیں تو لباس عریانی
مرگئے ہیں تو کفن ہے پتا

لوگ یکجائی میں رہتے ہیں سہیل
کس قدر، پھر بھی ہیں تنہا تنہا

کس طرح باور کروں میرا کہا سمجھیں گے آپ
جس قیامت کو نہ دیکھا اس کو کیا سمجھیں گے آپ

غیر کے غم کے مقابل خود کو رکھ کر دیکھیے
کب تلک صرف اپنے غم ہی کو بڑا سمجھیں گے آپ

طبع کا جب بُعد ہو اس نہج پر تو چپ بھلی
ورنہ پھر ہم کیا کہیں گے اور کیا سمجھیں گے آپ

جس عمل کو آپ کرتے ہیں سمجھ کر خوب تر
ہم عمل پیرا ہوں اس پر تو بُرا سمجھیں گے آپ

حد تو یہ کہ آپ کی نظروں میں جو شے ہے بری
ہم بری کہدیں تو اس کو بھی برا سمجھیں گے آپ

غیر کا احساس غم اس وقت کرنا آئے گا
اپنے غم کو غیر کا جب آئینہ سمجھیں گے آپ

جب ہماری حیثیت ہی کا تعین کچھ ہنیں
ایسے میں ہم کیا کہیں گے اور کیا سمجھیں گے آپ

رنگ خفت زعم کے چہرے پہ رقصاں ہوگیا
یعنی جلد از جلد خود کردہ نمایاں ہوگیا

بس یہی نا، ہم نہیں ہیں، تم ہی تم ہو ہر طرف
اس سے زائد اور کیا کارِ نمایاں ہوگیا

شام ہی سے جس نگارِ صبح کا تھا انتظار
شوقِ جلوہ اس کے دیکھے سے پشیماں ہوگیا

بھاگ کر گھر سے لیا زنداں میں سب نے آسرا
بابِ رحمت بے کسوں کے حق میں زنداں ہوگیا

میں نے کیوں یہ کہہ دیا کہ تیغ میں برش نہیں
میرا قاتل اتنا کہنے سے پریشاں ہوگیا

میری قاتل سے نکل آئی شناسائی سہیل
قتل کو آیا، سراپا لُطف و احساں ہوگیا

کیا مسیحائی کو آئے گا کوئی دارو لیے ؟
یا یونہی پھرتے رہیں گے ؤرد در پہلو لیے

شہر مایوسی میں ہے اس سے ہویدا زندگی
لوگ جیتے ہیں یہاں افواہ کے جگنو لیے

استخوانوں میں وہ ساری صورتیں تبدیل ہیں
جو پھرا کرتی تھیں آنکھوں میں رمِ آہو لیے

یہ بھی ممکن ہے کنارے سے چھلک کر پھیل جائیں
ندیاں جو بہہ رہی ہیں موج بے قابو لیے

ایسے ویراں ہوگئے پہچان میں آتے نہیں
کل پھرا کرتے تھے جو پیکر میں سو جادو لیے
اپنے کنبے سے کٹا ہر شخص میری طرح کا
ہجر جھیلے گا امید وصل کی خوشبو لیے

خود کو کرلولیں یارو خنجر مہتاب سے
رات آئی دام گیسو ، دشنۂ ابرو لیے

اے سہیل اس گھر کو راتوں رات آخر کیا ہوا
ایک بھی چہرہ نہیں ہم سائے کی خوبو لیے

ان کو یہ اصرار ہے یہ حریت بخشش نہیں
اس تغیر کے پس پردہ کوئی سازش نہیں

ہم یہ کہتے ہیں کہ اس میں طور ہے مہتاب کا
اس کے رخ پر مہر عالم تاب کی تابش نہیں

کس طرح باہر نکالے بانوئے خانہ قدم
جز در و دیوار خانہ پاس کچھ پوشش نہیں

آپ کہتے ہیں تو چلیے مان لیتے ہیں کہ ہم
ہر طرح آزاد ہیں ، قدغن نہیں ، بندش نہیں

اس کو اک گہرے سمندر کا بدل کیوں کر کہیں
جس کی باتوں میں خطابت ہے ، مگر دانش نہیں

عدل ہے گوشہ نشیں ، قانون کے ماتھے پہ سینگ
کیا عجب ہے بارآور جب یہاں نالش نہیں

سوچ کر جس شے کو آتا تھا طبیعت میں ابال
یہ ہوا کیا دیکھ کر بھی اس کی اب خواہش نہیں

دل ہوا جاتا ہے زہر غم کی اک آماج گاہ
کیا یہاں اب کارگر تریاقِ رامش نہیں

پھوٹتا تھا پر نہ پھوٹا سنگ سے اک بھی شرر
کی نہ ہو اس باب میں، ایسی کوئی کوشش نہیں

اس کو ہم اہل بصیرت کے سوا کیا نام دیں
جس کے پائے استقامت میں کوئی لغزش نہیں

ہے اسی میں عافیت ہوجایئے چپ چاپ قتل
قتل گہہ میں آج فِردِ جرم کی پرشش نہیں

اب تو یہ احساس بھی جاتا رہا دل سے سہیل
کیوں ہمارے رخت میں بستر نہیں بالش نہیں

اس نے تو بھیجا بنا کر پیکر فانی مجھے
میری کاوش نے کیا دنیا میں لافانی مجھے

میں نے تو غم سے نچوڑی ہے نشاط زندگی
ایک تحریکِ مسرت ہے پریشانی مجھے

میں تھا سنگ ناتراشیدہ کسی کہسار کا
آذری نے تیری بخشے صورت و معنی مجھے

مجھ کو صحرا میں بھی رہتی ہے تلاش یاسمن
لالہ اس باعث کہا کرتا ہے بستانی مجھے

ایک ہی سنگم میں حیرت سے رواں ہیں تا ہنوز
سیل میدانی ہے وہ اور راس طغیانی مجھے

مشکلوں سے ہو چکا ہوں اس قدر مانوس میں
ایک زحمت ہے بجائے خود یہ آسانی مجھے

غم مرا بھی کم نہیں پر دیکھ کر اوروں کے غم
بھول جاتی ہے معاً میری پریشانی مجھے

کرنے والے سے بہت ہی خوب کی تقسیم کار
آئینہ ان کو دیا ہے اور حیرانی مجھے

کشت اس کی بھی رہے یارب ہمیشہ آبیار
حلقۂ دریا میں مارا جس نے بے پانی مجھے

پھر ہوئی ہے بے لباسی کم نصیبوں کا لباس
پھر حجاب درمیاں لگتی ہے عریانی مجھے

یوں سمجھئے کہ غم ذات سے بالا ہونا
صحن احساس میں ہے اور اجالا ہونا

بطن گیتی میں ہوئے قتل ہزاروں سورج
حیف ان کا نہ ہوا بخت ہویدا ہونا

سنتے آئے تھے مگر دیکھا نہ تھا آنکھوں سے
اس طرح موت کا تفریح و تماشا ہونا

بس تنک ظرفی سے ہرگز نہ ہو مس کوئی بدن
بات اچھی ہے کسی بات کا سودا ہونا

اتنے عرصے میں بھی دل دار نہ ہوپائے وہ
ہم کو بھی آیا نہ افسوس دل آرا ہونا

عمر اک بیت گئی اس کی رفاقت میں مگر
پھر بھی آیا نہ اسے پیار میں افشا ہونا

ہر طرف دیکھتا ہوں مہر بہ لب سا ہیجان
جلد آجائے اسے کاش کہ گویا ہونا

تجربہ کہتا ہے میرا یہ عزیزو تم سے
رہنا جس مٹی پہ اس مٹی کا ذرہ ہونا

یہ بھی دل داری و ایثار کی صورت ہے سہیل
جائے گل شاخ کی آغوش میں کانٹا ہونا

خامہ جب فکر سے شیرینِ معانی مانگے
اس کنائے سے وہ فرہاد کی بانی مانگے

ہو کے تاراجِ نشاں جبکہ سرہ ہیں پڑے
کس لیے مجھ سے کوئی میری نشانی مانگے

کچھ کہیں صاحب احساس ہنیں. کہہ سکتے
جو زمانے سے جدا کوئی کہانی مانگے

لے کے ہمسایہ ہر ایک چیز اجازت کے بغیر
اک نشانی ہے سو وہ پھر نشانی مانگے

ایسا قاتل جو رکھے شمر کے سر پر بھی ہاتھ
خوں پلادے جو کوئی نزع میں پانی مانگے

اب جو آسائش جنت بھی میسّر ہو تو کیا
جی وہ اُوبا ہے کہ بس نقلِ مکانی مانگے

ایسی فطرت کہ ہنیں بیٹھنے خاموش کبھی
طبع ایسی کہ سدا ریشہ دوانی مانگے

آنکھ گزری ہے جس ارزانیِ خوں سے اس پر
کیا غلط ہے جو یہ خونابہ فشانی مانگے

شوق تقلید نے اس راہ پہ لا ڈالا ہے
ورنہ یہ راہ گزر غالب ثانی مانگے

کیا کہیں کون سا آئینہ اسے پیش کریں
یہ نیا دور ہے وہ راہ پرانی مانگے

وہ زمانے سے الگ آپ میں گم بیٹھا ہے
اور تو اس کے تخیّل کو زمانی مانگے

سختیِ شب سے گزرنے کی بھی ہمت رکھے
سرحدِ شب سے جو اک صبح سہانی مانگے

کم سخن اتنا بھی کاہے کو کوئی ہو کہ سہیل
اپنی باتیں ہوں پہ اوروں کی زبانی مانگے

زیست کرنے کے لیے کیا کچھ نہ کرلیتے ہیں لوگ
پیڑ کے پتوں سے اپنے پیٹ بھر لیتے ہیں لوگ

باربرداری میں گرتے ہیں جو دانے راہ میں
ان کو چن چن کر گزر اوقات کرلیتے ہیں لوگ

ایسا عالم ہے صفائی پیش کرنے کے بجائے
خامشی سے اپنے سر الزام دھرلیتے ہیں لوگ

ہم تماشائی کی صورت ہیں ہمارے باب میں
فیصلے جو چاہتے ہیں آپ کرلیتے ہیں لوگ

دیکھتے ہیں ظلم کا رقص برہنہ راہ میں
دیکھ کر بھی اپنی اپنی رہ گزر لیتے ہیں لوگ
ایک حرف مہرباں کا ہے بدل گھر کا اثاث
اک نگاہ لطف کے بدلے میں گھر لیتے ہیں لوگ

اک اذیت کے تسلسل سے نکلنے کو سہیل
اپنے سر کیا کیا نہ صدمات سفر لیتے ہیں لوگ

جس کے آنے پر ہیں ہم اس درجہ اترائے ہوئے
اپنی کوشش سے نہیں آئے وہ ہیں لائے ہوئے

ہم سا بھی بدبخت کیا ہو گا زمانے میں کوئی
جرم کس کا اور ہم اس کی سزا پائے ہوئے

اک ترحم کے لئے مجبور ماں کا ہے مثال
نیم جاں بچوں کو ہے راہوں میں پھیلائے ہوئے

وقت وہ آیا کہ دیکھا آجر و مزدور کو
ایک ہی صف میں کھڑے ہیں ہاتھ پھیلائے ہوئے

غیر کیا، ہمسائے کیا ہیں سب کے دل میں ایک طور
منتقم جذبات جیسے سانپ لہرائے ہوئے

سعی لاحاصل سے آگے کچھ نہیں پھر بھی مگر
نت نئی امید سے ہیں خود کو بہلائے ہوئے

اس حوالے سے مری دنیائے غم کو دیکھئے
چاند گہنائے ہوئے آئینے کجلائے ہوئے

وقت وہ آیا ردائے سر کو خیمہ کی طرح
دھوپ کی شدت سے بچنے کو ہے پھیلائے ہوئے

آئے تھے کس حوصلے سے پیڑ کے سائے میں ہم
کیا کہیں کس کس طرح قاتل وہی سائے ہوئے

اپنی غرقابی سے بڑھ کر غم ہوا اس بات کا
بیشتر دریا یہاں صورت میں تنگنائے ہوئے

آپ کا یہ مسئلہ کیوں کر سلجھ پائے سہیل
جن کو سلجھانا ہے وہ ہیں خود کو الجھائے ہوئے

میری بابت غائبانہ بات لایعنی کرے
لیکن استفسار پہ اظہار حیرانی کرے

مجھ پہ ازراہ عنایت جب وہ آسانی کرے
تجربہ یہ ہو کہ پیدا اور گراں جانی کرے

خون محرومی سے ہے شام پشیمانی میں رنگ
دیکھیے کیا صبح تک رنگِ پشیمانی کرے
خوش لباسی جیسے اب میرے لیے متروک ہو
دیکھ کر جس کو مرا ہمسایہ حیرانی کرے

کر گئی پوشاک جب عنقا کی صورت اختیار
زیب تن پھر آدمی کیوں کر نہ عریانی کرے
خامۂ پر خوں ہی جب بے مایہ ٹھہرا ہو تو پھر
کس طرح آخر کوئی شرح پریشانی کرے

اشتہا پر جب شکم سیری کا لمحہ خواب ہو
کیوں سحر تا شام کوئی پھر لہو پانی کرے

یہ بھی کہتا جائے مجھ کو آپ کا ہے احترام
اور پھر یہ بھی کہ ہر موقع پہ من مانی کرے

راہ میں زنداں نہیں ہے پھر بھی لگتا ہے سہیل
ہر قدم جیسے کوئی زنجیر جنبانی کرے

شہر میں ایسا ہمارے ایک بھی آنگن نہیں
صاحب خانہ کا جو مقتل نہیں مدفن نہیں

بے تعارف ہی بھلے لگتے ہیں رہنے دو یونہی
ہم پتا بتلائیں کیا اپنا کوئی مسکن نہیں

روزن و دیوار و در کے سارے جلوے قتل ہیں
چلمن آویزاں تو ہے پر رونق چلمن نہیں

دیکھ کر اس باغ کو صحرا ہے خونابہ فشاں
یوں چلی کالی ہوا کہ ایک بھی گلبن نہیں

حلقہ زنجیر ہے ہر لمحہ سائے کی طرح
وہ مگر باور کراتے ہیں کوئی قدغن نہیں

سب ادارے ساری بزمیں نذر آتش ہوگئیں
ایک بھی ان میں سلامت اہل فکر و فن نہیں

ہر کسی چہرے پہ ہے خاک خزاں اڑتی ہوئی
جلوہ در آغوش کوئی آنکھ کا روزن نہیں

گو نہیں ہے پھر بھی لگتا ہے کہ اب اس شہر میں
اے سہیل اپنا کوئی بندھو نہیں ، سجن نہیں

ادیب سہیل کی ایک نظم

(سمندر اور قطرے)

ڈاکٹر مشرف احمد

برصغیر جنوبی ایشیا کی تقسیم اور پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی اردو ادب میں فرقہ وارانہ فسادات کا موضوع سب سے اہم ٹھہرا تھا۔اس موضوع کی طرف وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اہل علم کی توجہ کم ہوئی تو افسانے اور شاعری میں ترقی پسندانہ ادبی روایات سے انحراف اور جدیدیت کا اظہار شروع ہوا، مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک اور ادبی احساس اور رویہ بھی اردو ادب میں اپنا اظہار کرتا رہا۔ یہ احساس ان اہل قلم کی تحریروں میں نمایاں تھا جو نظریاتی بنیادوں پر ترک وطن کر کے آئے تھے۔ وہ اپنے فیصلے پر مطمئن بھی تھے، لیکن ماضی کی یاد، جڑوں کی تلاش ان کی تحریروں میں بار بار آکر اپنا اظہار کرتی تھی، لیکن چوں کہ یہ بھی ایک سچا تجربہ تھا۔ بعض لکھنے والے اسی حوالے سے دنیائے ادب میں معتبر ٹھہرے۔ سقوط مشرقی پاکستان کے بعد ان علاقوں سے جو پاکستان میں شامل نہیں ہیں ہجرت کر کے آنے والے اردو اہل قلم کے طرز احساس میں ایک اور تبدیلی آئی۔ وہ دوسری ہجرت اور اس کی تباہ کاریوں کے زخم اٹھائے ہوئے تھے۔ ادیب سہیل کا شمار بھی ان ادیبوں میں ہوتا ہے۔ جو پہلے پاکستان کے مشرقی صوبے میں جا کر آباد ہوئے۔ انھوں نے پاکستان بنتے دیکھا اس کی جدو جہد میں شریک رہے۔ پھر ایک مجبور محب وطن پاکستانی کی حیثیت سے انھوں نے پاکستان کے ایک حصے کو بنگلہ دیش کا روپ اختیار کرتے دیکھا۔ قومیت کی تیز و تند آندھیوں میں انھوں نے دیکھا کہ اس تجربے سے گزرے وہ سب لوگ جو باہر سے آکر آباد ہوئے تھے ان کی حیثیت دراصل ایک سمندر کے مقابلے میں حقیر قطروں کی سی تھی۔

ادیب سہیل صاحب بھی اس حوالے سے ایک اہم شاعر قرار دیے جاسکتے ہیں۔ سیپ کراچی میں ان کی طویل نظم "سمندر اور قطرے" شائع ہوئی ہے جس کا زمانہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء (سقوط مشرقی پاکستان) تک ہے۔

غالب نے کہا تھا کہ عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا۔ ترک وطن اور ہجرت کر کے آنے والے افراد بھی نئی سرزمین کے سمندر میں ایک قطرے کی حیثیت رکھتے ہیں، مگر عشرت قطرہ کی منزل ابھی دور ہے۔آنے والوں اور پرانے لوگوں کے درمیان یہ عمل بڑی دیر میں انجام پاتا ہے۔ اور اس سے پہلے بڑی مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے۔ ادیب سہیل نے اپنی نظم میں تہذیبی لسانی، ثقافتی اور سیاسی وجوہ پر روشنی ڈالی ہے جس کی بنا پر قطرے سمندر کا حصہ نہ بن سکے۔ اس نظم میں انھوں نے ان تمام اسباب عوامل کا جائزہ تخلیقی سطح پر ایک حساس فنکار کی صورت پیش کیا ہے۔

نئے آنے والوں نے جس طرح اجنبی سرزمین میں زندگی بسر کی اور نئی زمین نے جس طرح آسودگی اور آسودہ حالی کے در ان پر وا کیے۔ اور آپس میں جن جن مسائل کی بنا پر باہمی تعلقات میں دوری اور ایک دوسرے سے نفرت پیدا ہوتی گئی اس تمام کو نہایت کام یابی سے ادیب سہیل نے رمز و دانائیہ میں بیان کیا ہے۔ نظریے سے محبت کرنے والوں کے سروں پر ایک طوفان بلا خیز گزرا اور نظم کا اختتام پھر ان ہی احساسات پر ہوتا ہے۔ جو آغاز سفر میں تھا۔